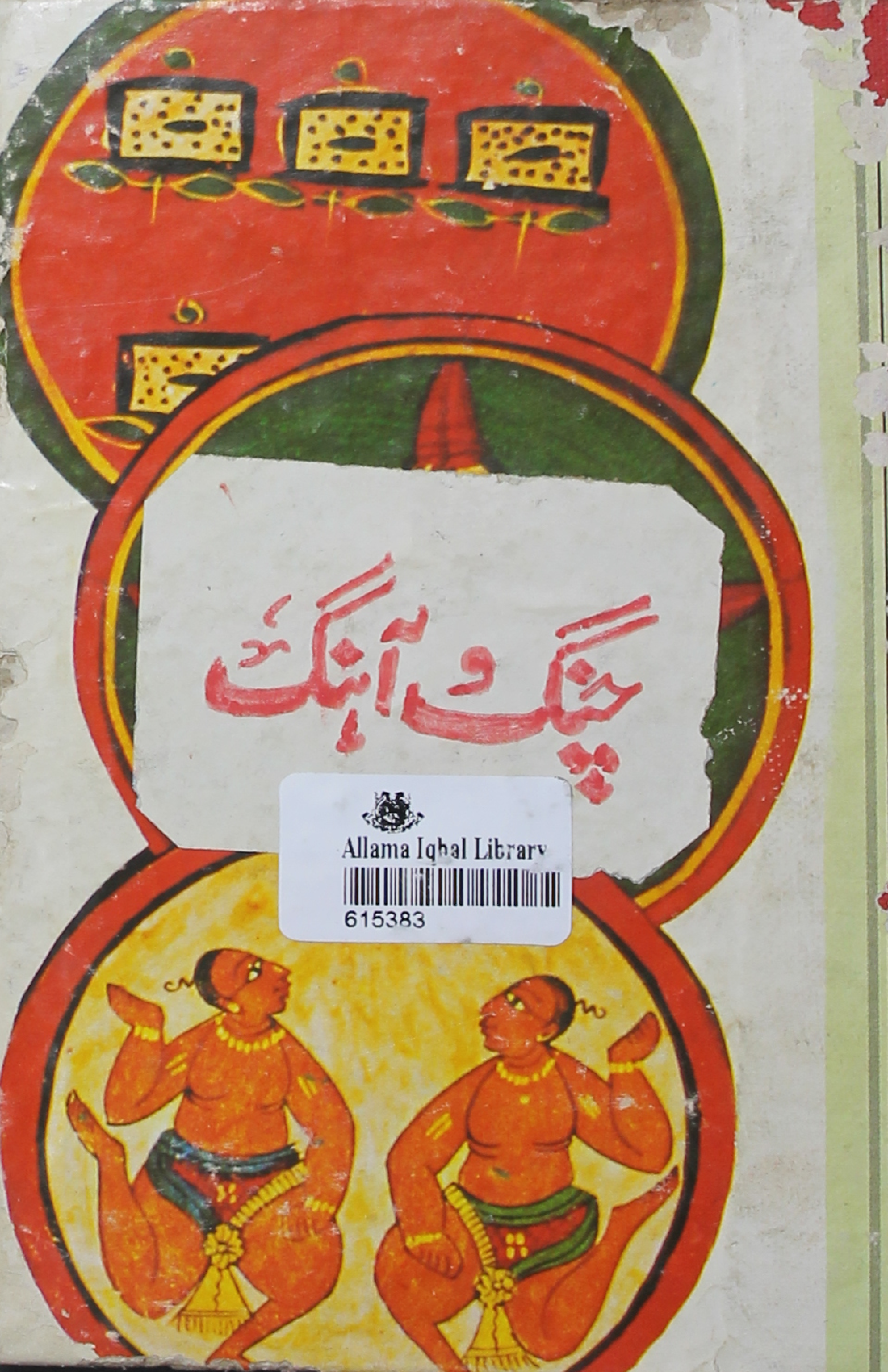


چنگ و آہنگ

چنگ و آہنگ

عرش ملسیانی

ودّیاشنکر کے نام

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

پبلشر:- مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر)
پرنٹر:- محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

باراوّل (۱۹۵۳) عیسوی ایک ہزار

قیمت تین روپے

فہرست

تعارف

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

عرش صاحب، کچھ اُوپر پانچ برس سے میرے جلیس و رفیق ہیں، اور اس طرح کہ انھیں اگر ایک دن بھی نہیں دیکھتا ہُوں تو ایسا معلُوم ہوتا ہے گویا ایک سال گُزر چکا ہے۔

یہ حضرت جوش ملسیانی کے فرزند ہیں۔ جوش صاحب کو نئی پَود نہیں جانتی، اور جان بھی نہیں سکتی، کیوں کہ جوش صاحب کی ذات جن ادبی محاسن کا مجموعہ ہے، اُن کی چھاؤں بھی اُس پر نہیں پڑی ہے۔

عرش صاحب کی یہ غیر معمولی طاقت نہیں تو اور کیا ہے کہ، وضعِ عالم کے خلاف، وہ ایک "بڑے" باپ کے "چھوٹے" بیٹے نہیں بن سکے ہیں۔ اور اپنی شخصیت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ اُن کا کاملِ فن بُوڑھا باپ اُن کی ذات پہ ناز کر سکتا ہے۔

عرش صاحب کی پرورش اُسی محدود، روایتی، باسی، غیر فطری اور نیم وحشی فضا میں ہوئی ہے جسے غزل کی فضا کہتے ہیں۔ اور ہرچند، بالغ و عاقل ہونے کے باوجود اب بھی وہ اِس امر کا ارتکاب کرتے ہیں، جسے غزل گوئی کہا جاتا ہے، اور جیسا کہ حضرت آزاد انصاری نے میرے باب میں، یادش بخیر کہا تھا، وہ ابھی تک ع "افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل" کے زُمرے میں داخل نہیں ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجُود، اور یہ خاصی حیرت کی بات ہے کہ وہ اُن بلندیوں تک بھی جاتے ہیں جہاں فطری شاعری کا علَم لہراتا اور حقیقی شعریت کی بجلیاں چمکتی رہتی ہیں، اور ان بلندیوں پر پہنچ کر وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اعلیٰ شاعری کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر کی جوانی، بناسپتی جوانی، اور اس کی شاعری کا بھی بڑا حصّہ، نامِ خدا، بناسپتی ہی ہے اور کیوں نہ ہو کہ نئے ادیبوں کی پشت پر اسلاف کا وہ ادبی سرمایہ ہی نہیں ہے جس سے اخلاف کا ادب پروان چڑھتا اور پنپتا ہے —— اس ذہنی افلاس اور جسمانی ضعف کی بنا پر ہمارے نئے شاعر لسانی وفنی دشواریوں سے بچ کر آسان راستوں پہ قدم رکھتے، اور جو پابندیاں ادب کے چہرے پہ خوں دوڑاتی ہیں، کاہلی، کمزوری اور بے مائیگی کی بناء پہ اُن پابندیوں سے دامن بچا کر نکل جانے کی سعی میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔

ان بے چاروں کو کون سمجھائے کہ شاعری کی دُنیا میں "کیا کہا ہے" کی اِس قدر قدر نہیں جتنی کہ "کیوں کر کہا" کی قدر ہوتی ہے۔

"کیا کہا ہے" کی منزل میں ہمیں کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، وہ تو فطرت کا ایک ع درِ نہ بستانی کَبستم می رسد کی نوعیت کا ایک فیضان وعطیّہ ہے، اور بس۔

لیکن "کیوں کر کہا ہے" کی منزل ہنسی کھیل نہیں۔ "کیا کہا ہے" کو جب اس "کیوں کر کہا ہے" کی ورکشاپ میں لایا جاتا ہے، تو ہو سے لگ جاتے ہیں اور اُس اعلیٰ ترین ذہنی عمل اور ژرف نگاہی کی ضرورت پیش آتی ہے، جیسے تاج محل کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔

یکایک ٹھوکر لگنا اور کوڑے کرکٹ میں ہیرے کا مل جانا صرف خوش قسمتی ہے، لیکن اُس کا صاف کرنا، تراشنا، اور اُسے ہشت گوشہ بنانا ایک ایسی صنّاعی وفن کاری ہے جو انسانی تاریخ میں ہمیشہ سراہی گئی ہے۔

ہمارے آج کل کے "کاتا، لے دوڑی" طرح کے شاعروں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ کام جس قدر اعلیٰ، عظیم اور باریک ہوتا ہے، اُس کی تکمیل کے آلات وشرائط بھی اُسی مناسبت سے گوناگوں اور پیچ در پیچ ہوا کرتے ہیں۔

جب اِس دَور کے "کام چور، نوائے حاضر" شعراء کے مقابلے میں عرش صاحب پر نگاہ پڑتی ہے تو میرے دل میں اُن کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ایک طرف تو یہ اللہ کا بندہ "کیا کہا" کے فیضان سے نہال ہے، اور دوسری طرف "کیوں کر کہا" کی دِیدہ وَری سے بھی مالا مال ہے ——— اور یہ وہ سعادتِ کبریٰ ہے جس کی بخشش میں قدرت نہایت بخیل واقع ہوئی ہے —— عرش صاحب اپنے اس جوہر پر جس قدر بھی ناز کریں، کم ہے۔

آخر میں ایک بات اور کہہ دُوں، ورنہ میرے دل میں کھٹک باقی رہ جائے گی۔

سب جانتے ہیں کہ حیوانوں کی دنیا میں مَنفعت و مضرّت کے لحاظ سے، چرندوں کو درندوں پر فوقیّت حاصل ہے ——— لیکن اس کے قطعی برعکس، انسانوں کی دُنیا میں حرکت و جمُود کے لحاظ سے، "انسان دَرِندوں" کو "انسان چرِندوں" پر تفوّق حاصل ہے۔

یہ ایک پیچیدہ بات ہے، جو تشریحِ تام کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔

لیکن میں تشریح نہیں کروں گا، اس لئے کہ تشریح سے اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ ہمارے اس ماشاءاللہ آسمانوں تک پالے ہوئے ملک کی زمین پر زلزلے کا شدید جھٹکا محسوس کیا جائے گا اور ہمارے جنّتی دوستوں کے دل زخمی ہو جائیں گے۔

اسی لئے اِس "ظلم بر حیوانات" سے اجتناب کرتے ہوئے صرف اس قدر کہوں گا کہ ہمارے دوست عرش صاحب کا شمار "انسان درندوں" میں نہیں، بلکہ خیر سے "انسان چرندوں" میں ہے۔

اس لئے کہ وہ (خدا اُنھیں نظرِ بد سے بچائے) نہ تو کھانے کی چیزیں کھاتے، نہ پینے کی چیزیں پیتے، نہ سونگھنے کی چیزیں سونگھتے، نہ ٹٹولنے کی چیزیں ٹٹولتے، نہ برتنے کی چیزیں برتتے اور نہ جھپٹ پڑنے کی چیزوں پر جھپٹتے ہیں —— اِن بے چارے کی تمام تر زندگی

محض چارے اور خالص گھاس پھونس سے وٹامن حاصل کرتی ہے۔

لیکن بڑی حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر اپنی اس "بے مزہ" پرہیزگی کے باوصف جب وہ اپنی ذکاوت و جودت، ذہانت و فطانت، زندہ دلی و ظرافت، اور اعلیٰ ادبیّت و شعریّت سے مسلّح ہو کر محفل میں جلوہ فرماتے ہیں تو بھرپور "رِند" معلوم ہوتے ہیں اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:-

بسرِّ خدا کہ عارفِ کامل بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟!

جوشؔ

۹ر اپریل ۱۹۵۳ء

تین بجے صبح - دہلی

دیباچہ

پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد دکن

کم و بیش ربع صدی کا عرصہ گذرا ہوگا کہ جناب عرش ملسیانی نے شعر و سخن کے میدان میں قدم رکھا، اور اس طرح قدم رکھا کہ:

عرش فرزندِ جنابِ جوش ہے — شاعری اس کے لئے ہے گھر کی بات

حضرت جوش ملسیانی جیسی دقتِ نظر رکھنے والے اُستاد اور شعر کی قدر کو پرکھنے والے سخن سنج ہیں، اِس کا اندازہ خود اُن کے کلام اور اُن کی شرح غالب سے ہوتا ہے۔ ایسے اُستاد کے گھر سے ظاہر ہے کہ کوئی ادنیٰ ذوق رکھنے والا شاعر نہیں اُٹھ سکتا تھا۔ شعر و سخن کا چسکا عرش کو بچپن ہی سے تھا اور خاص طور پر غنائی شاعری کی لَے اِن کے کانوں میں رچی ہوئی تھی۔ اُردو شاعری کی روایات میں بھی وہ پُوری طرح منجھے ہوئے تھے۔ اس لئے تھوڑی ہی مدت میں وہ منظرِ عام پر چمکنے لگے اور جس فضا میں وہ چمکے، وہ شعر و سخن کے چرچوں سے بسیرِ حاصل کہی جاسکتی ہے۔ ایک طرف اقبال کے ترانے اس فضا میں گونج رہے تھے تو دوسری طرف محروم جوش ملسیانی، حفیظ جالندھری نئی غنائیت اور نئی شعری قدروں کی بنیاد رکھ رہے تھے۔

حضرت جوش ملسیانی غزل کے مانے ہوئے اُستاد ہیں، اور اس کا گہرا اثر جناب عرش پر نہ پڑتا تعجب کی بات ہوتی۔ عرش کو غزل کی صنف پر کس قدر قابو حاصل ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اکثر اپنے ماحول کی تحریکوں کے اظہار کے لئے غزل کی رمزیت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

عرش غزل کو اگلے اساتذہ کے معیاروں پر برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، سوائے اس کے

کہ کوئی ضمنی اجتہاد کی صورت کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ لیکن ان کی اس کوشش کے باوجود، یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ عرش اپنے عصر کی پیداوار ہیں۔ اِن کے شعور کی اُٹھان کا زمانہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا تحریک زا دَور ہے، جس کی سیاسی اور معاشی شکست و ریخت اور افراتفریوں نے تصوّرات اور افکار کی ایک نئی دُنیا تعمیر کرنی شروع کی تھی، اور اس کا نتیجہ ایک نئے سماج کی تخلیق کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا تھا۔ اس نئے سماج کا ایک جزو شاعر بھی تھا۔ نیا سماج اپنے نئے تصوّرات اور تخیلات کے اظہار کے لئے فطرتاً نئے ادبی سانچے تلاش کر لیتا ہے، اور نئے تجربے چاہتا ہے۔ ان اثرات سے عرش اپنے شعور یا تحت شعور کے دامن کو کیسے بچا سکتے تھے؟ اسی لئے، روایت کی پابندی کرتے ہوئے بھی وہ عام طور پر اپنی شاعری اور خاص طور پر غزل کو اپنے عصر کے دلوں کی دھڑکنوں، ذہنوں کے ارتعاش، غرض روحِ عصر کے تموّج سے ہم آہنگ کرنے پر مجبور تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی نظم تو اپنے عصر کی فکر کا پرتو ہے ہی، ان کی غزل بھی روحِ عصر کی جنبشوں کے ساتھ متحرک نظر آتی ہے۔

عرش کے کلام کا ایک مجموعہ "ہفت رنگ" اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کی ترتیب نظموں کی نوعیت اور موضوع کے لحاظ سے سات ابواب میں کی گئی تھی۔ "چنگ و آہنگ" میں زمانی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔ دونوں مجموعوں کی کئی نظمیں مشترک ہیں، لیکن "چنگ و آہنگ" شاعر کے ذہنی ارتقاء کا خاکہ زیادہ مکمل طور پر پیش کرتا ہے۔

اس مجموعے میں عرش کا ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک سرانجام کیا ہوا کلام شامل ہے۔ اس ترتیب میں شاعر نے ایک جدّت کی ہے۔ کلام کی ترتیب میں پچھلے زمانے سے حال کی طرف آنے کے عام دستور کی بجائے، وہ حال سے ماضی کی طرف گئے ہیں۔ اور اس طرح کی ترتیب میں شاید یہ نفسیاتی نکتہ مضمر ہے کہ ہم پہلے حال سے واقف ہو کر ماضی کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال کا کلام جو اس مجموعے کے تیسرے دَور کا کلام ہے ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کے زمانے پر مشتمل ہے۔ اگلے

دَور کا کلام ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک دُوسرے دَور اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک پہلے دَور پر تقسیم ہے۔ ہر دَور میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ دُوسرے دَور کے کلام میں کچھ رُباعیاں بھی ہیں اور پہلے دَور میں کچھ گیت شامل ہیں۔ ہر دَور میں غزلوں اور نظموں کی ترتیب بھی اسی اصول پر کی گئی ہے جس اصول پر کلام کی ترتیب ادوار میں ہوئی ہے۔

اس طرح اس مجموعے سے ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک شاعر کے ذہنی ارتقا کے نقوش کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر کی سیاسی اور سماجی تحریکوں اور تاثرات کا بھی اچھا خاصہ خاکہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ ابتدائی دَور میں عرش اگرچہ پابند روایت شاعر تھے اور عمومی تجربات کو عمومی اصطلاحوں اور اسالیب میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے تھے، تو بعد کے ادوار میں، جب اُن کی خود اعتمادی اپنے آپ کو محسوس کرانے کی صلاحیت کو نشوونما دینے لگتی ہے تو وہ "سِرّ دلبراں" کے ذاتی تجربوں کو بھی، کبھی تو "حدیثِ دیگراں" کے پردے میں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی تو وہ اس مہین پردے کو چاک کر کے اپنے تجربوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس مرحلے میں پہنچ کر عرش کی فکر کے ڈانڈے ہمارے عصر کی ان شعری تحریکوں سے مل جاتے ہیں جنہیں پُرانی تحریکوں سے ممیز کرنے کے لئے کبھی تو ترقّی پسند شاعری اور کبھی نئی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گو عرش نے اپنے آپ کو شاعروں کے اس مخصوص زمرے میں شامل کرانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اصطلاحاً نہ سہی، معناً وہ ترقّی پسند شاعر ہیں۔ شاعری ان کے لئے عموماً اپنے اطراف کی زندگی کے کچھ مسائل کو پیش کرنے کا واسطہ ہے، وہ ہندوستان کے کروروں بھوکے پیاسے عوام کے دُکھوں کے شریک اور اُن کی مسرّتوں کے ساتھی ہیں۔ ان کی ہمدردیاں جغرافی سرحدوں کو پار کر کے عالمگیر بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ انسان آخر سب ہی انسان ہیں۔ وہ ہر طرح کے استحصال کا پول کھولتے ہیں، خواہ وہ مذہب یا وطن کے مقدّس نام پر ہی کیوں نہ کیا جا رہا ہو۔ اس معاملے میں انہیں رہبروں سے شکایت ہے، جن کے بھیس میں ان کی نظر اکثر رہزن کو تاڑ لیتی ہے۔ عرش بھارت

کے پجاری ہیں اور وطن کی محبت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، پھر بھی ان کے کچھ معیار یہاں بھی نمایاں ہیں۔ وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی وطن کا نام لیتے ہوئے سچائی کی سرحد کو پار کر جائے۔ یہ وفاداریاں اصل میں عرش کی سرشت میں ایک تناسب کے ساتھ واقع ہوئی ہیں۔ بھارت، ایشیا اور سارا عالم جو انسان آباد ہے ــــ جہاں ہند کی عظمت پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں، وہیں ”ایشیا کو چھوڑ دو“ اور ”سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک“ کے فسادات میں وہ ایشیا کی عظمت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ عرش کی نظم ”جنگ کوریا“ دراصل انسانیت اور مظلوم انسانیت کی ہوک ہے۔ اسی جذبے میں وہ ایک موقع پر ایشیائی اور یورپی کے فرق کو بحرالکاہل کی عمیق گہرائیوں میں دفن کر دینا چاہتے ہیں۔ شاید ایسے ہی لمحات تھے جن میں شاعر کی آنکھ ایک عالمی حکومت کا خواب دیکھتی ہے، جس کے سایہ میں چھوٹے بڑے سرمایہ دار اور کنگال، کالے اور گورے سب امن اور آشتی کی زندگی بسر کر سکیں۔

فرماتے ہیں

کھول دے میکدہ محبت کا — نام اونچا ہو آدمیت کا
تخت باقی رہے نہ کوئی تاج — سارے عالم پہ ہو عوامی راج
ہو اخوت کی اس طرح تخلیق — کالے گورے کی دور ہو تفریق
ایک فرمان پہ چلے عالم — ہو بنائے نظامِ نو محکم

ہندوستان کی عظمت پر عرش کی نظمیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں، ان سے شاعر کی والہانہ محبت اور احترام کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ عرش کے ہم وطن اقبال نے بھی ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے تھے بعد میں وہ بھی جب ایک عالمی برادری کے حصول کے لئے اسلام کے نظامِ اخوت اور مساوات کا پرچار کرنے لگا تو اسے غلط سمجھا گیا۔ لیکن اس بڑے شاعر کی بے وقت موت کا ماتم کرتے ہوئے عرش کی نظر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھی ہوئی محبتِ وطن کو اچھی طرح تاڑ لیتی ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں:

جس کے فرحت زا ترانوں میں تھا نام پاکِ ہند — رو اسے جی بھر کے رو، جی بھر کے رو اے خاکِ ہند

اصل میں ہمارا دور وہ دور ہے، جس میں شاعر کو خیال کی تحریک کے لئے اساتذہ قدیم کے دیوانوں کی جھاڑیوں کے اطراف بھٹکنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، بلکہ خود اُس کے اطراف بیسیوں موضوع بھٹک رہے ہیں۔ اب شاعر کی بے دماغی اُسے سماج سے بیزار رہنے بھی نہیں دیتی، کیونکہ سماج کی اس کو ضرورت ہے۔ اب اس کی سرپرستی کے لئے شاہانہ ممدوح نہیں رہے بلکہ اس کو مادی زندگی بسر کرنے کے لئے اپنی محنت سے روزی کمانی ہے اور اس کی ذوقی زندگی کو عوام کے تخیلات اور تصوّرات کے ردِّ عمل کا ہم آہنگ ہونا ہے۔ اس طرح آج کی شاعری اگلے دور کی شاعری نہیں رہ سکتی۔

عرش کی شاعری مسائل کی شاعری بھی ہے اور غنائی اور فکری شاعری بھی، شاعر کے ذہن کے ان رُخوں کے مطابق جو فطرتاً متبادل ہوتے رہتے ہیں۔ اس مجموعے میں یہ تینوں رُخ موجود ہیں۔ عرش کی غزلیں، کچھ نظمیں اور گیت، اُن کی غنائی شاعری کے وہ نمونے ہیں جن کا ذوق انھیں اپنے والد محترم سے ورثے میں ملا ہے۔ لیکن اس ورثے کو انھوں نے جوں کا توں بھی نہیں رہنے دیا بلکہ اُن کی مخصوص ذہنیت اور ان کے ماحول کے اثرات نے، اس میں صوری اور معنوی ہر حیثیت سے کافی اضافہ کیا۔ مثال کے لئے غزل کے بہت سے ایسے مشترک موضوع ہیں، جو عرش کی شاعری میں ایک نئی معنویت کا رُوپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ میکدہ وہ شعور و خرد کی مے کا امیں — کہ دھوئی جاتی ہے جس میں حماقتِ انساں
وہ میکدہ کہ جہاں روحِ آدمیت ہے — وہ میکدہ کہ جہاں تازہ ہوتے ہیں ایماں
وہ میکدہ کہ ہے ظلماتِ جہل سے محفوظ — وہ میکدہ کہ جہاں مہرِ عقل ہے تاباں

رہبر یا تو رہزن نکلے یا ہیں اپنے آپ میں گم
قافلے والے کس سے پوچھیں کس منزل تک جانا ہے

جینا جنگ ہے طوفانوں کی موت ہے میٹھی نیند فقط
جینے سے جب ڈر نہیں تجھ کو موت سے کیا گھبرانا ہے

یہ لافِ برہمن و شیخ زادگی کیسی — کوئی غرورِ نسب سے ہنیں ہے نیک سرشت
خیالِ حور و قصور و مئے طہور نہ کر — اگر تو غور سے دیکھے تو زندگی ہے بہشت
یہ مسجد اور یہ مندر، خدا کے گھر، توبہ — اور ان میں آکے تو کرتا ہے آرزوئے بہشت
ترے فریب و ریا کے ہیں مقبرے گویا — یہ رکھ دئے ہیں جو چن چن کے تو نے سنگ اور خشت

غزل کی رمزیت اور اشاریت میں یہ بیانات، دراصل شاعر کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے بیان ہیں۔ اس طرح روایتی شاعری میں بھی روحِ عصر متحرک ہے۔ کہیں کہیں یہی روایتی مضمون، شاعر کے اسلوب کی جدت کی وجہ سے اُس کے اپنے ذاتی تجربات کا دھوکا بھی دیتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں:-

ہم صفیرو، یہ مسرت کا ترانہ کیسا — ہو تو لینے دو ابھی قید سے آزاد مجھے
نہ نشیمن ہے، نہ ہے شاخِ نشیمن باقی — لطف جب ہے کہ کرے اب کوئی برباد مجھے

ہے دیکھنے والوں کو سنبھلنے کا اشارہ — تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں

جھک گئی نقشِ قدم پہ جوشِ اُلفت سے جبیں — بے خودی میں اب تلاشِ جادہ و منزل کہاں
کہہ رہی تھی صبحدم یہ شمع کی افسردگی — سوزِ پروانہ نہ ہو تو گرمیٔ محفل کہاں

گلہ کیا اگر عمرِ فانی ملی ہے — اسی سے تو مجھ کو جوانی ملی ہے

اسی کا فلک ہے اسی کی زمیں ہے — یہ دنیا محبت کے زیرِ نگیں ہے

کچھ قصور ساقی کا، کچھ ہے ابرِ باراں کا — قابلِ سزا ناحق جرمِ مے پرستی ہے
میرے دل کی ویرانگی پوچھتے ہو کیا مجھ سے — تم نہیں تو ویرانہ تم رہو تو بستی ہے

نقابِ رُخ اُٹھنے کو تو اس نے بار ہا اُٹھی — بُرا ہو اپنی حیرت کا کہ ہم خود گم نظر نکلے

اس کے مقابلے میں "واردات" کے عنوان سے شاعر نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے شاعر کے ذاتی تجربے ظاہر ہوتے ہیں۔

عرش کی موضوعاتی نظمیں بھی کافی ہیں اور ان میں سے کچھ تو غنائی اور تخیلی ہیں لیکن بیشتر نظمیں عصرِ حاضر کے حالات اور مسائل پر شاعر کے تاثرات یا اُس کی تنقید ہیں۔ آخری نوع کی نظموں میں، وُہ جو ملک کی سیاسی ہلچل سے تعلق رکھتی ہیں، ۱۹۲۶ء سے لے کر حال کے زمانے تک کے بہت سے سیاسی واقعات کا ردِّعمل ہیں۔ عرش نے فرقہ وارانہ فسادات پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں، جن کا منتہا، ۱۹۴۸ء کے خونیں مناظر پر ہوتا ہے۔ یہ نظمیں ایک طرح پر ایک خاص دور کی سیاسی تاریخ ہیں۔ ان کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوں جوں آزادی کی منزل قریب آ رہی تھی، یہ ہلچل بڑھتی جا رہی تھی۔ چوٹی کے چند قائدین کو چھوڑ کر، ایسا واضح تخیل رکھنے والے شاید ہی کوئی ہوں گے جو آزادی کی جھلک دیکھ سکے ہوں۔ ہاں شاعر کی آنکھ کے سامنے سے پردے ہٹ رہے تھے جب وہ کہتا ہے ؎

فندقِ آزادی کی شہنائی کے ساتھ　　کان پردے نے چھیڑ دی ماتم کی دھن

اس ہلچل کے منتہا کا نقشہ "۱۹۴۷ سے ۱۹۵۰ تک (فسادات)" میں نظر آتا ہے۔

"ہولی" پر عرش کی ایک دو نظمیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں، وہ بہت ہی پُرلطف اور پاکیزہ شاعری کا نمونہ ہیں۔ ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

پھر شباب مست نکلا مل کے چہرے پر گلال　　پھر نکھر آیا بہارِ لالہ سے حُسنِ چمن
پھر جنونِ زندگی کو مل گیا نام شرر　　پھر نظر آنے لگا ہر سادگی میں بانکپن
ڈھولکیں، باجے، مجیرے اور کھرتالیں بجیں　　پھر فضائیں ہو گئیں بنسی کی لے سے نغمہ زن
رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں گوپیاں سر تا قدم　　اُودے اُودے، پیلے پیلے، نیلے نیلے پیرہن

ہولی اور دیوالی کے تہوار ہندوستان کے چوٹی کے تہوار ہیں، جن میں ساری قوم کے چھوٹے

بڑے، بچّے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، سب کے سب فکرِ فردا سے بے نیاز ہو کر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ لیکن عرشؔ ان رنگ رلیوں میں بھی، اپنے ملک کے زبوں حال طبقے کا دُکھ دل سے نہیں بھلا سکتے۔ "ہولی اور ہندوستان" اور "دیوالی" میں شاعر کے تاثرات اُس کی انسان دوستی کے آئینہ دار ہیں۔

عرشؔ کی فکر نے عالمی مسائل کے بعض موکرتہ آلارا پہلوؤں کو بھی مس کیا ہے۔ عہدِ جدید کے صنعتی انقلاب نے انسانوں پر جو مظالم توڑے ہیں، اُن کا ردِّ عمل "جنگ کوریا" میں نظر آتا ہے۔ زندگی عرشؔ کے لیے ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اور زندگی عمل سے بہشت بن سکتی ہے عشق زندگی کا رہنما ستارہ ہے۔ ذیل کے چند شعر انہیں حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں:

دل ہی بے نور ہو تو شاید ہو | عشق کی راہ تو نہیں تاریک
موت سے ڈر کے بے عمل جینا | زندگی کی ہے یہ بڑی تضحیک
چوٹ جب تک نہیں کوئی لگتی | دل میں ہوتی نہیں کوئی تحریک

غم، زندگی کے بہترین امکانات کو اُبھارنے کا وسیلہ ہے، زندگی میں غم کا نہ ہونا ایک مصیبت ہے۔

دل ہے لیکن دل میں کوئی غم نہیں | یہ مصیبت بھی تو آخر کم نہیں
کس کو دنیا میں ہوئی راحت نصیب | کون دنیا میں اسیرِ غم نہیں

غم سہتے ہوئے بھی زندگی میں ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ شاعر ایسی زندگی کو زندگی نہیں بلکہ زندگی کا مضحکہ سمجھتا ہے، جو ہر حادثے کا شکار ہو جائے۔ کہتے ہیں:-

ہوا کا ایک جھونکا تجھ کو جب چاہے بجھا ڈالے | یہ کیا جینا ہے دُنیا میں چراغِ رہ گزر ہو کر

ذیل کے اشعار میں عرشؔ کی فکر کے کچھ حکیمانہ زاویے غور کے قابل ہیں:

کس کا قُرب کہاں کی دُوری اپنے آپ سے غافل ہو | راز اگر پانے کا پُوچھے، کھو جانا ہی پانا ہے
خرد کو بے مایہ کرنا آتا یہ زہد کیسا یہ بندگی کیا | خرد کا افلاس دُور ہو گا تو دولتِ آگہی ملے گی

ہاں دیدۂ تحقیق سے اے ذوقِ سفر دیکھ
رہبر جسے سمجھا ہے وہ رہزن تو نہیں ہے

بے سعیٔ عمل خاک ہے انسان کا جینا
یہ رزم گہِ زیست ہے مدفن تو نہیں ہے

تکلیفِ اسیری کی شکایت نہ کر اے دل
یہ کنجِ قفس کنجِ نشیمن تو نہیں ہے

خواہشِ معدوم اچھی خواہشِ ناکام سے
حیف اس پہ پھول بن کر جو کلی مرجھا گئی

رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی
رہرووں کا نشاں نہیں ملتا

حفظِ چمن کے غم میں یہ صیاد نے کہا
جو بجلیوں کی زد میں ہے وہ آشیاں رہے

آہ ان طائروں کی خوش فہمی
ہو کے آزاد جو اسیر ہوئے

سجدہ کرتے بھی ہیں انساں خود درِ انساں پہ روز
اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں

اجارہ دارانِ عیش و مستی زمانہ اب رُخ بدل رہا ہے
کبھی تو مجھ بدنصیب کو بھی فراغتِ زندگی ملے گی

ایک ہُو سے پھاند جاتے ہیں خرد کی منزلیں
یوں جنونِ نرم رو کو برق پا کرتے ہیں ہم

بارگاہِ خزاں میں ایک ہیں سب
کوئی کانٹا ہُوا کہ پھول ہُوا

زندگی کشمکشِ عشق کے آغاز کا نام
موت انجام اسی درد کے افسانے کا

فریبِ آرزو پُر لطف ہے ترکِ تمنّا سے
سکوں افزائے دل ہے عشق کی ہنگامہ آرائی

یہ شاعری گویا اپنے عصر کی محتاط اور نفیس فکر کا آئینہ ہے اور ایسی شاعری کے دیرپا ہونے کے بارے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔

عبدالقادر سروری

۶۵۳ ۳/۴

تیسرا دور

۱۹۵۲ — ۱۹۴۶

غزلیں

یہ دنیا ہے اسے دارالفتن کہنا ہی پڑتا ہے

یہاں ہر راہبر کو راہزن کہنا ہی پڑتا ہے

وفورِ عقلِ انساں سے بڑھی انساں کُشی اتنی

وفورِ عقل کو دیوانہ پن کہنا ہی پڑتا ہے

ہمارا ذکر بھی اس میں ہے غیروں کا چہکنا بھی

تمہاری انجمن کو انجمن کہنا ہی پڑتا ہے

وہ صحرا جس میں کٹ جاتے ہیں دن یادِ بہاراں سے

بالفاظِ دگر اس کو چمن کہنا ہی پڑتا ہے

گُل افشانیٔ گفتارِ مجاہد بے اثر ہو جب

تو اس کو قصّۂ دار و رسن کہنا ہی پڑتا ہے

بتانِ سنگ دل میں ہے نزاکت کا بھی اک پہلو

انھیں سیمیں بدن گُل پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے

اسی صورت سے کم ہوتا ہے کچھ آزارِ غربت کا

دیارِ غیر کو اپنا وطن کہنا ہی پڑتا ہے

یہاں کتنوں کے جی چھوٹے یہاں کتنوں کے دم ٹوٹے
وفا کی راہ کو ہمّت شکن کہنا ہی پڑتا ہے

بُرا کیا ہے جو حُسنِ سادہ کو پُرفن کہا ہم نے
خضر کو بھی تو اکثر راہزن کہنا ہی پڑتا ہے

اگر انجام کو پیشِ نظر رکھیں تو مجبوراً
جہانِ عیش کو دارالمحن کہنا ہی پڑتا ہے

زباں سمجھے نہ سمجھے کوئی اپنی عرشؔ اس پر بھی
وطن اپنا ہے یہ اس کو وطن کہنا ہی پڑتا ہے

حُسن پر دسترس کی بات نہ کر
یہ ہوس ہے ہوس کی بات نہ کر

پُوچھ اگلے برس میں کیا ہوگا
مجھ سے پچھلے برس کی بات نہ کر

اے اسیری سے چھُوٹنے والے
اب تو دام و قفس کی بات نہ کر

یہ بتا حال کیا ہے لاکھوں کا
مجھ سے دو چار دس کی بات نہ کر

یہ بتا قافلے پہ کیا گزری
محض بانگِ جرس کی بات نہ کر

قصّۂ شیخِ شہر رہنے دے
مجھ سے اس بوالہوس کی بات نہ کر

عشقِ جاں آفریں کا حال سُنا / حسنِ عیسیٰ النفس کی بات نہ کر
معرکہ عشق کا ہے بڑھتا جا / اب یہاں پیش وپس کی بات نہ کر
وُہ رہائی نہیں سکوں جس میں / اک قفس ہے قفس کی بات نہ کر
نالۂ نیم رس سے کیا ہو گا / نالۂ نیم رس کی بات نہ کر

یہ بتا عرش سوز ہے کتنا
ساز پر دسترس کی بات نہ کر

۱۹۵۲

دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی / مگر وُہ یاد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی
چمن میں کون ہے پُرسانِ حال شبنم کا / غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی
نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا / لباسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی
کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے / نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی
عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا / ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی
زمانہ ہنستا ہے مجھ پر ہزار بار ہنسے / تمہاری آنکھ میں لیکن یہ کیوں نمی آئی
دئے جلائے اُمیدوں نے دل کے گرد بہت / کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی
ہزار دید پہ پابندیاں تھیں پردے تھے / نگاہِ شوق مگر اُن کو دیکھ ہی آئی

یہ انتقامِ مشیّت نہیں تو اور ہے کیا — ہمارے حصے میں دُنیا کی دوستی آئی

کسی طرح نہ مٹا عرشؔ داغِ کفرِ انا
ہمارے کام نہ سجدے نہ بندگی آئی

۱۹۵۲

جس تمنّا پہ شباب آیا اسے موت آ گئی — زندگی بھی زندگی کے نام سے شرما گئی

پہلے آزردہ بنایا دل کو پھر بہلا گئی — ہم پہ کیا کیا نازِ اُن کی آرزو فرما گئی

خواہشِ معدوم اچھی خواہشِ ناکام سے — حیف اس پہ پھول بن کر جو کلی مرجھا گئی

آہ عبرت ناک تھا کتنا بیانِ عاشقی — زندگی کی داستاں سے زندگی گھبرا گئی

اب فقط تو ہی سہارا ہے مرا اے جورِ دوست — دامِ تزویرِ وفا ہر آرزو پھیلا گئی

بے امید و بیم رازِ زندگی پاتا نہ میں — اک یہی اُلجھن تھی جو عقدے مرے سلجھا گئی

کون ہوگا اب ہدف ناکامیٔ تدبیر کا — زندگی کی راہ میں تقدیر تو کام آ گئی

اب عیاں ہوتے پھرو تم اب نہیں دیکھے گا کون — دید کی حسرت میں چشمِ منتظر پتھرا گئی

مار ڈالا عرشؔ یوں تو دوستوں کے لُطف نے
یہ غنیمت ہے کہ آخر زندگی کام آ گئی

۱۹۵۲

دوستی کا نشاں نہیں ملتا
کوئی اپنا یہاں نہیں ملتا

کارواں سے کچھ اس طرح بچھڑے
اب کہیں کارواں نہیں ملتا

درد معراج کو پہنچتا ہے
جب کوئی ترجماں نہیں ملتا

رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی
رہروؤں کا نشاں نہیں ملتا

بے زباں ہو گئے زباں والے
اب کوئی ہم زباں نہیں ملتا

زندگی کے وجود میں بھی اب
زندگی کا نشاں نہیں ملتا

بے رخی اور بات ہے ورنہ
ملنے والا کہاں نہیں ملتا

گل بھی ہیں گلستاں بھی ہے موجود
اک فقط آشیاں نہیں ملتا

عرش کس سے کہوں میں دل کا راز
راز ہے راز داں نہیں ملتا

۱۹۵۷

اُن سے غرض نہیں جو شکارِ خزاں رہے
لیکن وہ پھول جو ہدفِ باغباں رہے

ہمدم رہے نہ عرش مرے ہم زباں رہے
اللہ تجھ پہ رحم کرے تو جہاں رہے

اِک وہ جو غرق ہو کے ہوئے قعر آشنا — اک ہم جو سطحِ آبِ رواں پر رواں رہے

حفظِ چمن کے غم میں یہ صیّاد نے کہا — جو بجلیوں کی زد میں ہے وہ آشیاں رہے

ہم اس چمن کے پھول ہوئے بھی تو فائدہ — شبنم کا آفتاب جہاں پاسباں رہے

ہم کو حرم میں بھی ہے بتانِ حرم کا غم — اندازہ دانِ کفر رہے ہم جہاں رہے

اُن رہبروں کے رحم پہ منزل رہی ہے عرشؔ
جو محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے" ۱۹۵۲

وُہ وفا و مہر کی داستاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی تو بھی تھا مرا مہرباں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ترے لُطفِ خاص نے جو دیا تری یاد نے جو عطا کیا
غمِ مستقل غمِ جاوداں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وُہ جو شورِ لطفِ سخن رہا وہ جو زورِ لطفِ بیاں رہا
مرے ہم سخن مرے ہم زباں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو ترے لئے مرے دل میں تھا جو مرے لئے ترے دل میں تھا
مجھے یاد ہے وہ غمِ نہاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تری دوستی پہ مرا یقیں مجھے یاد ہے مرے ہم نشیں
مری دوستی پہ ترا گماں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ کرم شعاریٔ دشمناں وہ ستم طرازیٔ دوستاں
مرے نکتہ رس مرے نکتہ داں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وُہ جو شاخِ گل پہ تھا آشیاں جو تھا وجہِ نازشِ گلستاں
گری جس پہ برقِ شرر فشاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میرے دل کے جذبۂ گرم میں مرے دل کے گوشۂ نرم میں
تھا ترا مقام کہاں کہاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اسے مانتا ہوں میں مہرباں ہیں ترے رفیق بہت یہاں
کبھی میں بھی تھا ترا رازداں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ جو عرشؔ شکوہ طراز ہے جسے ہرزہ گوئی پہ ناز ہے
یہ وہی ہے شاعرِ خوش بیاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(مشاعرۂ کراچی ۱۹۵۱)

جو درِ حسن کے فقیر ہوئے دولتِ عشق سے امیر ہوئے
سارے عالم میں ہو گئے مشہور جو محبت کے گوشہ گیر ہوئے

آہ ان طائروں کی خوش فہمی — ہو کے آزاد جو اسیر ہوئے
اُن کے طعنے جو دل پذیر نہ تھے — عشق میں وہ بھی دل پذیر ہوئے
چھیڑ بھی اُن سے بے مثال ہوئی — اُن سے شکوے بھی بے نظیر ہوئے

عرش پیری میں بھی ہے وہ جواں
جن کے ارماں کبھی نہ پیر ہوئے

۱۹۵۱

اک فقط مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں — اے خدا دنیا میں تیری ورنہ کیا ہوتا نہیں
عاشقی میں جوہرِ فطرت فنا ہوتا نہیں — رنگِ گُل سے نغمۂ بُلبل جدا ہوتا نہیں
کیوں مرے ذوقِ تصوّر پر تمہیں شک ہو گیا — تم ہی تم ہوتے ہو کوئی دوسرا ہوتا نہیں
ہم کو راہِ زندگی میں اس قدر رہزن ملے — رہنما پر بھی گمانِ رہنما ہوتا نہیں
سجدے کرتے بھی ہیں انساں خود درِ انساں پہ روز — اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں
ناخدا کو ڈھونڈ جا کر حلقۂ گرداب میں — بندۂ ساحل نشیں تو ناخدا ہوتا نہیں
ترکِ اُلفت بھی مصیبت ہے اب اس کا کیا علاج — وہ جدا ہو کر بھی تو دل سے جدا ہوتا نہیں

عرش پہلے یہ شکایت تھی خفا ہوتا ہے وہ
اب یہ شکوہ ہے کہ وہ ظالم خفا ہوتا نہیں

۱۹۵۱

حسن سے دور رہ کے بھی نزدیک
عشق اک راز ہے بہت باریک

دل ہی بے نور ہو تو شاید ہو
عشق کی راہ تو نہیں تاریک

موت کے ڈر سے بے عمل جینا
زندگی کی ہے یہ بڑی تضحیک

چوٹ جب تک نہیں کوئی لگتی
دل میں ہوتی نہیں کوئی تحریک

عشق کا ہر بیاں بیانِ غلط
حسن جو بھی کہے سراسر ٹھیک

جس قدر عشق سے گریز ہوا
اس قدر عشق کی ہوئی تحریک

نور لے مشعلِ عمل سے عرش
ہے اگر راہِ زندگی تاریک

۱۹۵۱

وہ چمن میں آئے تو شاخیں گلستاں ہو گئیں
گل قصیدہ خواں ہوئے کلیاں غزل خواں ہو گئیں

شوقِ جلوہ تو بہت تھا لیکن اس کا کیا علاج
حیرتیں بھی ساتھ جلووں کے نمایاں ہو گئیں

اب کرم سمجھوں اسے یا امتحانِ شوقِ دید
اک جھلک سے ہی فضائیں طور ساماں ہو گئیں

مشکلیں تھیں اُن کے دم سے حوصلے تھے عزم تھا
اُف کہ اب اُن کے کرم سے وہ بھی آساں ہو گئیں

۱۹۵۱

جنونِ عرفاں میں غرق ہو کہ بھلا کہیں بیخودی ملے گی
جو طاعتِ جامِ مے کرو گے تو جنّتِ سرخوشی ملے گی

نہیں زمانے کی ظلمتوں میں نشان کوئی بھی روشنی کا
بس اک تمنّائے روشنی ہے اسی سے کچھ روشنی ملے گی

زمانہ بدمذاق اور میں خدائے انصاف تو کہاں ہے
مرے شعور اور آگہی کی کبھی مجھے داد بھی ملے گی

اجارہ دارانِ عیش و مستی زمانہ اب رُخ بدل رہا ہے
کبھی تو مجھ بد نصیب کو بھی فراغتِ زندگی ملے گی

خیالِ تعمیر کے اسیرو کرو نہ تخریب کی بُرائی
بہ غور دیکھو تو دُشمنی کے قریب ہی دوستی ملے گی

خرد کو بے مایہ کہہ نہ اتنا یہ زہد کیسا یہ بندگی کیا
خرد کا افلاس دُور ہوگا تو دولتِ آگہی ملے گی

کبھی تو اس زندگیٔ مُردہ پہ رنگ آئے گا زندگی کا
کبھی تو بدلیں گے دن ہمارے کبھی تو ہم کو خوشی ملے گی

عتاب کرنے دو عرشؔ ان کو کہ اس میں بھی مصلحت نہاں ہے
مزاج کو برہمی ملے گی تو حُسن کو دلکشی ملے گی

۱۹۵۰

جوابِ تلخ میں شامل ملامت اور ہو جاتی
جہاں سب کچھ ہُوا اِتنی عنایت اور ہو جاتی

نہیں گو فرق کچھ گھر اور مے خانے میں اے واعظ
وہاں پیتے تو ساقی کی زیارت اور ہو جاتی

دکھاتے ہو جہاں سو سو طرح سے دُور کے جلوے
اسی صورت کوئی ملنے کی صورت اور ہو جاتی

پلائے یُوں تو مَیخانے سے تو نے جام بھر بھر کر
اِن آنکھوں سے بھی ساقی کچھ عنایت اور ہو جاتی

وہ آئے بھی مگر چھیڑی نہ اپنی داستاں ہم نے
قیامت میں بپا ورنہ قیامت اور ہو جاتی

خطائیں مان لیں سب ہیں نے یہ اچھا کیا ورنہ
پشیمانی سے بچنے کی ندامت اور ہو جاتی

۱۹۴۶

تیسرا دور

۱۹۵۲ — ۱۹۴۶

نظمیں

فرار

اپنے اندازِ تغافل کو نہ بدلو بے سُود
کم نگاہی کے تسلسل کو نہ بدلو بے سُود
تمکنت اور تجاہل کو نہ بدلو بے سُود

راہبر ہو نہیں سکتے ہو تو رہزن نہ بنو
غمِ جاناں مجھے دے کر مرے دُشمن نہ بنو
غمِ جاناں کی حدوں سے تو نکل آیا ہُوں

ہاں وہی سلسلۂ جور و جفا اور رہے
وہی ناقدریٔ اربابِ وفا اور رہے
چاہنے والوں سے کھنچنے کی ادا اور رہے

اب محبّت کے تقاضوں سے کوئی کام نہ لو
غمِ جاناں کا مرے سامنے اب نام نہ لو
غمِ جاناں کی حدوں سے تو نِکل آیا ہوں

کرم آمیز ستم کا تو زمانہ ہی نہیں
ناوک افگن نہ بنو اب وہ نشانہ ہی نہیں
وہ کہانی ہی نہیں اب وہ فسانہ ہی نہیں

جس کو سو بار سُنا ہے نہ سُناؤ مجھ کو
غمِ جاناں کی حقیقت نہ بتاؤ مجھ کو
غمِ جاناں کی حدوں سے تو نکل آیا ہوں

آرزوئے دلِ ناکام بھی تو بن نہ سکے
تم مرے مرجعِ آلام بھی تو بن نہ سکے
دانہ تھا پاس مگر دام بھی تو بن نہ سکے

اب مجھے مفت میں شرمندۂ احساں نہ کرو
غمِ جاناں کی قسم دے کے پشیماں نہ کرو
غمِ جاناں کی حدوں سے تو نکل آیا ہوں

۱۹۵۲

واردات

کیفیتِ دیدارِ سرِ راہ نہ پُوچھ
اِس کیف کو اے ندیم للّٰلہ نہ پُوچھ
برسوں کے شناسا بھی نہیں یُوں ملتے
کِس طرح ملی مجُھ سے وہ ناگاہ نہ پُوچھ

ہر روز مجھے دُور سے تکتا ہَے ہَے
پاس آ کے مگر بول نہ سکتا ہَے ہَے
رُکنے کے ارادے میں وہ گھبراہٹ سی
وہ سر سے دوپٹّے کا سرکنا ہَے ہَے

لرزیدہ سا ہونٹوں پہ تبسّم توبہ
اُلجھی سی نِگاہوں کا تکلّم توبہ
اُمیدِ ملاقات نہ ہو جب باقی
وہ راہ میں ناگاہ تصادم توبہ

ہوتی ہے سرِ راہ ملاقات یُونہیں
مِلتی ہے مجھے دید کی سوغات یُونہیں
دِن آئے تو وہ ساعتِ دیدار آئے
کٹتی ہے اس اُمید میں ہر رات یُونہیں

یہ آج ترا نکھار عادت کے خلاف — یہ چشمِ فسوں کار، یہ رخسارۂ صاف
بل کھائے ہوئے جبینِ تاباں پہ یہ لٹ — جیسے ہو رقم شیشۂ شفّاف پہ قاف

یہ غنچگیٔ تمام یہ بدمست شباب — یہ جسم کی رگ رگ میں رواں موجِ شراب
قامت ہے کہ ہے ایک لچکتی ہوئی شاخ — ٹکڑا ہے کہ ہے ایک تر و تازہ گلاب

ہمراہ ہے وہ باغ میں ہنگامِ خرام — کرتی ہے ہر اک شاخ اُسے جھک کے سلام
فطرت کی نوازش سے ہے اک بارشِ کیف — ہر نخل ہے میخانہ ہر اک پھول ہے جام

ہر موجِ نفس جوابِ مُل ہے گویا — انگڑائیوں میں قوس کا پُل ہے گویا
بُوٹا سا یہ قد، پھول سے یہ نقشِ قدم — ہر ایک روش تختۂ گُل ہے گویا

تسکینِ اثر و عیش نشاں آئی ہے — وہ حورِ سکوں بخش جہاں آئی ہے
ہاں گردشِ دوراں سے یہ کہہ دو رُک جائے — آغوش میں وہ راحتِ جاں آئی ہے

دِن بھر جو دُعا کی تھی وہ کام آئی ہے		وہ صُبح کی ملکہ سرِ شام آئی ہے
شرمندہ و افسردہ ہے ہر سیج کا پھُول		وہ پیکرِ رعنائی تام آئی ہے

یہ چہرۂ روشن یہ دہکتی ہوئی آگ		یہ گیسوئے پیچاں یہ تھرکتے ہوئے ناگ
آغوش میں سوتے ہوئے یہ ہیبتِ حُسن		اے فتنۂ خوابیدہ ذرا نیند سے جاگ

۱۹۴۷ سے ۱۹۵۰ تک

(فسادات)

خیاباں و باغ و چمن جل رہے تھے		بیاباں و کوہ و دمن جل رہے تھے
گلستاں و سرو و سمن جل رہے تھے		گل و غنچہ و نسترن جل رہے تھے

جہنم کے شعلے تھے ہر اک فضا میں
شرر ہر طرف اُڑ رہے تھے ہوا میں

چلے مَوج در مَوج نفرت کے دھارے		بڑھے فَوج در فَوج وحشت کے مارے
ہوئے فتنہ و شر میں باہم اشارے		چلے قلبِ معصومِ انساں پہ آرے

اِدھر الاماں تھی اُدھر الحذر تھا
شرافت کا ڈر تھا نہ عزت کا ڈر تھا

نہ ماں کی محبّت ہی محفوظ دیکھی — نہ بیٹی کی عصمت ہی محفوظ دیکھی
نہ بہنوں کی عزّت ہی محفوظ دیکھی — نہ بھائی کی اُلفت ہی محفوظ دیکھی

یہ نفرت کی تعلیم تھی یا قیامت
وطن کی یہ تقسیم تھی یا قیامت

وہ ہندو و مُسلم جو شِیر و شکر تھے — خلوص و محبّت کے گھر جن کے گھر تھے
جو بھارت کی آنکھوں کے نورِ نظر تھے — فساد اور فتنے سے جو بے خبر تھے

اُنھیں غیر نے باہم اتنا لڑایا
کہ سُوجھا کسی کو نہ اپنا پرایا

ہُوا شور ہر سمت بیگانگی کا — ہُوا زور ہر دِل میں دیوانگی کا
ہُوا عام افلاس فرزانگی کا — ہُوا نام بدنام مردانگی کا

جو نفرت نے رکھے تھے اب تک اُدھورے
جنوں نے وہی کر دیئے کام پُورے

جو ہندی تھے ہندو مسلماں بنے تھے — جو بُزدل تھے وہ مردِ میداں بنے تھے
ملک تھے جو سیرت میں شیطاں بنے تھے — جو انساں کے بیٹے تھے حیواں بنے تھے

وُہ بدنام مذہب وہ ننگِ زمانہ
حسد اور اُن پہ ہُوا تازیانہ

شقاوت پہ مذہب نے سب کو اُبھارا پڑوسی کو اُٹھ کر پڑوسی نے مارا
نہیں تھا کوئی بیکسوں کا سہارا نہ پایا کہیں اس مصیبت کا چارا

جفا کا نشانہ بنے خامشش بندے
قضا بن کے نکلے ستم کوش بندے

مچائی وہ عصمت دروں نے تباہی کہ فریادِ غم کی بھی کر دی مناہی
سزاؤں کے قابل تھی ہر بے گناہی ہر اک سمت نازل تھا قہرِ الٰہی

کسی سے نہ کٹتے ہوں جب غم کے پھندے
پئے داد خواہی کہاں جائیں بندے

جدائی کا نعرہ لگاتے رہے جو جدائی کا جادو جگاتے رہے جو
جدائی کی باتوں میں آتے رہے جو جدائی کو لازم بتاتے رہے جو

انھیں کب خبر تھی کہ یہ حال ہوگا
وطن اس جدائی سے پامال ہوگا

جو تقسیم پہ جان و دل سے فدا تھے وطن میں جو رہ کر وطن سے جدا تھے
نمازی تھے دیندار تھے باخدا تھے بڑے متقی تھے بڑے پارسا تھے

اُنھیں کو خدا کی خدائی نے مارا
اِسی فتنہ پرور جدائی نے مارا

جو کہتے تھے اب ملک بٹ کر رہے گا
جو حصّہ ہمارا ہے کٹ کر رہے گا
قدم آشتی کا رپٹ کر رہے گا
گریباں محبّت کا پھٹ کر رہے گا

اُنھیں کے مقدّر میں آوارگی ہے
مصیبت ہے، آفت ہے بیچارگی ہے

جو مندر میں رہ کر تھے مسجد کے دُشمن
سیہ دل تھے جن کے محبّت کے مدفن
سمجھتے تھے جو رہنما کو بھی رہزن
جو خود کاٹتے تھے اخوّت کی گردن

وہی گھر سے بے گھر پھرے خوار ہو کر
ہر اپنے پرائے سے بیزار ہو کر

جنوں نے اُٹھائے وہ فتنے مسلسل
کہ سارا وطن بن گیا ایک مقتل
اُٹھے دُشمنی کے پُر آشوب بادل
بہا خونِ آدم مچی سخت ہلچل

وُہ عالم تھا پیکار کا کچھ نہ پُوچھو
وُہ ریلا تھا آزار کا کچھ نہ پُوچھو

فسوں گر نے جو سحر پھونکا غضب تھا
یہ آپس میں لڑنے کا عالم عجب تھا
ہر اک سمت ماتم تھا رنج و تعب تھا
بلا تھا یہ بلوہ مگر بے سبب تھا

مداری نے ایسا تماشا دکھایا
کہ خود ہم نے اپنا تمسخر اُڑایا

خرد مٹ چکی تھی جنوں تھا نمایاں — عمل سے یہ ظاہر تھا وحشی ہیں انساں
بہ حکمِ دیانت لُٹے ساز و ساماں — بہ نامِ حفاظت جلے قصر و ایواں

مصائب کے طوفان یوں ٹل رہے تھے
اِدھر سے اُدھر قافلے چل رہے تھے

پرایوں سے بھی کوئی سر جوڑتا ہے — اقارب سے بھی کوئی مُنہ موڑتا ہے
وطن سے کوئی رشتہ یُوں توڑتا ہے — کوئی اپنے گھر کو بھی یُوں چھوڑتا ہے

اِدھر سے اُدھر تھا وہ ہجرت کا عالم
مِثال اس کی دے گی نہ تاریخِ آدم

جو ہیں زخم دل میں وہ کس کو دکھاؤں — درندوں کے جَور و ستم کیا سُناؤں
مظالم کی تفصیل میں کیا بتاؤں — اُٹھاؤں تو یہ بار کیونکر اُٹھاؤں

غش آ جائے گا روحِ انسانیت کو
ہنسی لوگ سمجھیں گے یزدانیت کو

اگر مرد کو پاسِ عورت نہیں کچھ — اگر دل میں اس کے شرافت نہیں کچھ
اگر بہرِ نسواں مروّت نہیں کچھ — اگر اس کو پاسِ حمیّت نہیں کچھ

تو اس مرد کو مرد کیوں کر کہیں ہم
مناسب یہی ہے کہ پتھر کہیں ہم

گلی کوچہ بازار سب لُٹ رہے تھے　　امیر اور نادار سب لُٹ رہے تھے
شریف اور بدکار سب لُٹ رہے تھے　　غریب اور زردار سب لُٹ رہے تھے

گیا اِس طریقے سے دورِ غلامی
کہ ہر سمت زوروں پہ تھی بدلگامی

غرض تھی خرد سوز شدّت جنوں کی　　اک آواز اِس شور میں تھی سکوں کی
اِسی کو خبر کچھ تھی دردِ دروں کی　　مداری کے تفریق افزا فسوں کی

کہا اُس نے، ٹھیرو، لڑائی کو چھوڑو
محبّت کے رشتے کو ہرگز نہ توڑو

کہا اس نے کب ہوش میں آؤ گے تُم　　اگر یوں لڑو گے تو مٹ جاؤ گے تُم
اگر خانہ جنگی کو پھیلاؤ گے تُم　　تو اپنے کئے کی سزا پاؤ گے تُم

نہ ہوگا خیالِ کم و بیش اب بھی
رہو گے یُونہی کیا بداندیش اب بھی

مگر اُڑ گئی بات اُس کی ہوا میں　　پھنسا ملک کا ملک دامِ بلا میں
بڑا فرق آیا خلوص و وفا میں　　گھرے بے گنہ لوگ رنج و عنا میں

نجیبوں کو قسمت ہوئی سرگرانی
رذیلوں کا حصّہ ہوئی شادمانی

غنیمت ہے اب وہ فسوں مٹ چکا ہے   لڑائی کا مہلک جنوں مٹ چکا ہے
کدورت گا دردِ دروں مٹ چکا ہے   عداوت کا شوقِ زبوں مٹ چکا ہے

بہ ظاہر سہی ربط باہم تو ہے کچھ
ستم ہائے بے جا کا ماتم تو ہے کچھ

جو آجائے اس ربط میں پائیداری   اگر ہو محبت میں کچھ استواری
اگر صلح جوئی ہو رگ رگ میں ساری   سُدھر جائے واللہ قسمت ہماری

سعادت کا ہو جائے ہر گھر میں ڈیرا
محبت کا ہو ایشیا میں بسیرا

وہی ایشیا علم و حکمت کا مخزن   وہی ایشیا مال و دولت کا معدن
وہی ایشیا صلح و اُلفت کا مسکن   وہی ایشیا عیش و راحت کا مامن

زمانے کو درسِ اخوت پڑھائے
جو گُمراہ ہیں راہ پر اُن کو لائے

ہوس مُلک گیروں کی ہے تیز سنبھلو   بڑھے آرہے ہیں یہ چنگیز سنبھلو
لڑائی یہ چھیڑیں گے خونریز سنبھلو   ہیں اطوار ان کے شر انگیز سنبھلو

محبت اگر ہے تو سب کچھ ہے تم میں
نہیں یہ تو جب تھا نہ اب کچھ ہے تم میں

1950

ایشیا کو چھوڑ دو

خون چُوسا جان لی اب جسم بھی کھاتے ہو تُم
اے سیاسی کرگسو کیوں ظلم فرماتے ہو تُم
ایشیا کے غم میں کیوں دُبلے ہوئے جاتے ہو تُم
اب بلا سے کچھ بھی ہو تم نے تو گھر کو بھر لیا، کام اپنا کر لیا
ٹُوٹ پر بُنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

بن کے تاجر حرص کا دامن بہت پھیلا چُکے
تیل بھی تم پی چکے اور کوئلہ بھی کھا چکے
کوئلہ کھا کھا کے ہم پر آگ بھی برسا چکے
اب تو گھر کی راہ لو چھوڑو یہ جنگِ زرگری، ایشیا کی رہبری
ٹُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

بے کسوں کے غم میں مرنے کے لئے طیّار ہو
سادگی کا روپ بھرنے میں بڑے پُر کار ہو
گمرہوں کو راہ پر لانے کے ٹھیکیدار ہو
اہلِ مشرق کے لئے یہ جاں فشانی کس لئے، سرگرانی کس لئے
ٹوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

تُم نے پھیلایا ہزاروں سال ہمدردی کا دام
تُم نے صدّیوں تک مچایا شورِ بہبودِ انام
تُم نے قرنوں تک لئے جاہل غلاموں کے سلام
اب بھی تم ان کی حفاظت کے لئے مجبور ہو کس قدر معذور ہو
ٹوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

رہزنی کے آج تک باقی ہیں یہ انداز کیوں
ہر گھڑی تازہ ہے اب بھی رسمِ حرص و آز کیوں
کر رہے ہو ایٹمی طاقت پہ بے جا ناز کیوں
اِن گناہوں پر بھی عذرِ بے گناہی کس لئے، یہ تباہی کس لئے
ٹوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

کوریا، جاپان، انڈونیشیا ہو یا سیام
فارموسا، مشرقِ وسطیٰ، ملایا، ویٹ نام
اِن میں اب کوئی نہ مانے گا تمھیں اپنا امام
چھوڑ کر جھوٹی امامت کام اپنا کیجیے، اِن کو جینے دیجیے
لُوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رِشتے توڑ دو، ایشیا کو چھوڑ دو

۱۹۵۰

جنگِ کوریا

بُجھ گیا امن و آشتی کا دِیا
جنگ کی کوریا سے آئی صدا
صُلح کے راستے ہوئے مسدود
پھر چلے ٹینک پھر اُڑی بارود
شہر کے شہر کر دیئے برباد
بڑھ گیا اہرمن سے آدم زاد
پھر اُڑے آسماں پر انگارے
چھا گئے پھر فضا پہ طیارے
خلق توپوں سے پائمال ہوئی
خون سے پھر زمین لال ہوئی
چہرۂ زندگی اُتر سا گیا
موت کا رُوپ کچھ نکھر سا گیا

سیل بن کر تباہیاں آئیں | زندگی کو جماہیاں آئیں
الاماں الاماں کا شور ہُوا | ہر طرف وحشتوں کا زور ہُوا
چہرۂ زیست ہو گیا ہے فق | چاک ہر سینہ، ہر کلیجہ فق
بُردباری سے دل ہوئے خالی | بج گئی دونوں ہاتھ سے تالی
صُلح کے نام پر لڑائی ہے | امنِ عالم تری دہائی ہے
صُلح جوئی سے بڑھ گئی پیکار | آدمی آدمی سے ہے بیزار
آدمیت کا سینہ چاک ہُوا | قصّہ انسانیت کا پاک ہُوا
آدمی زاد سے خدا کی پناہ | اس کے ہاتھوں ہے، اس کی نسل تباہ
مہ جبیں دربدر پریشاں ہیں | نیک بندے نزار و نالاں ہیں
کون پُرساں ہے غم کے ماروں کا | کم سِنوں اور بے سہاروں کا
نوجواں ہی بچے نہ پیر بچے | مردِ میداں نہ گوشہ گیر بچے
آندھیاں ظُلم کی چلیں ہر سُو | دَورِ حاضر پہ صد ہزار تفو
ہاں یہی دَورِ عقل و علم کا دَور | "آشتی"، "صلح" اور "حلم" کا دَور
یہ تعدّی یہ جور کیا کہنا | وحشتوں کا یہ دَور کیا کہنا
کوئی وعدہ بھی پائیدار نہیں | ایک کو اک پہ اعتبار نہیں
جو ہے کمزور وہ غلام ان کا | یہ ہے دستورِ انتقام ان کا

اپنے گھر میں بجائیں عود و چنگ — غیر کے گھر میں شور فتنہ و جنگ
شعبدے ہیں یہ ملک گیروں کے — ہوس و حرص کے اسیروں کے
ساقیا یہ ہے وقت رستاخیز — آج تو لا شراب تند و تیز
تیرا بادہ ہے بادۂ صافی — ہر مرض کے لئے ہو الشافی
ذہن انساں ہے آج کل بیمار — اب تو اس کا علاج ہے دشوار
دے اسے ایک جام ایک ہی جام — اے کہ تو ہے امین خیر انام
کھول دے میکدہ محبّت کا — نام اونچا ہو آدمیت کا
ایک فرمان پر چلے عالم — ہو بنائے نظام نو محکم
تخت باقی رہے نہ کوئی تاج — سارے عالم پہ ہو عوامی راج
ہو اخوّت کی اس طرح تخلیق — کالے گورے کی دور ہو تفریق
آدمی آدمی سے مل کے رہے — غنچۂ صلح عام کھل کے رہے
شرق پر جور غرب مٹ جائے — دل آدم کا کرب مٹ جائے

ہو تہ آب بحر کاہل غرق
ایشیائی و یورپی کا فرق

1950

یہ وقت نہیں اب جانے کا

چلتی ہے ہوائے رُوح فزا یہ وقت نہیں اب جانے کا
پُرکیف ہے رُت، دلکش ہے فضا یہ وقت نہیں اب جانے کا
ہر منظرِ شب ہے ہوش رُبا یہ وقت نہیں اب جانے کا
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

یہ چرخ پہ لکہ ابرِ رواں یہ چاند یہ تاروں کا عالم
یہ صحنِ چمن یہ گُل بُوٹے یہ پھُول یہ پھولوں پر شبنم
یہ سرد ہوا یہ سنّاٹا، شاخوں کا گلے ملنا باہم
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

یہ مست فضا یہ خاموشی، خاموشی کا یہ اذنِ طرب
فطرت کا سحر اٹھ جوبن، عشرت افزا یہ محفلِ شب
جذبات کا یہ پیغام تو سُن، ہاں دیکھ یہ دل کا حُسنِ طلب
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

باقی نہ رہیں جب ضبط و سکوں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
جب زور پہ ہوں جذباتِ جنوں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
جب دل پہ بنا دے دردِ دروں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

کافر ہے جو ایسے عالم میں نشےّ میں طرب کے چُور نہ ہو
کیفیتِ عیش و عشرت سے بدمست نہ ہو مسرور نہ ہو
منظور تری ہر بات مجھے لیکن تو مجھ سے دُور نہ ہو
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

میں تجھ سے نہیں غافل مطلق مجھ سے یہ مگر غفلت کیسی
باطن میں محبّت لاکھ سہی، ظاہر میں یہ نفرت کیسی
جس عزم سے رنج ملے مجھ کو اس عزم کی اب جرأت کیسی
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

جس شیشۂ دل کو توڑا ہے اُس شیشۂ دل کو جوڑ بھی دے
جس بات سے دل کو ٹھیس لگے اس بات سے رشتہ توڑ بھی دے
جانے کا ارادہ مہلک ہے جانے کا ارادہ چھوڑ بھی دے
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

ہے تیز ہوائے عیش مگر کیوں تجھ کو ہوا یہ راس نہیں
کیوں غنچۂ اُلفت میں تیرے دلجوئی کی بُو باس نہیں
ہر روز نہیں جو ضد کرتا کیوں اس کی ضد کا پاس نہیں
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ یہ وقت نہیں اب جانے کا

۱۹۵۰

یومِ غالب

لوگ کہتے ہیں کہ اجداد پرستی نہ کرو
یہ زمانہ نہیں اجداد پرستی کے لئے
کیف آور ہے ہر اک جُرعۂ مئے تازہ کا
مئے کُہنہ ہی تو لازم نہیں مستی کے لئے

صفحۂ دہر پہ چھوڑو نہ کوئی نام سلف
کارِ نیک اس سے بڑا اور نہیں ہے کوئی
توڑ دو عظمتِ ماضی کے سبھی کُہنہ صنم
نعرہ اب اس کے سوا اور نہیں ہے کوئی

شور ہر سمت ہے اب وقت ٹھہرنے کا نہیں
نامِ اسلاف مٹاؤ تو بڑا کام کرو
کُہنہ افکار کی تعمیر تو بوسیدہ ہے
اس گھروندے میں نہ اب بیٹھ کے آرام کرو

لوگ کہتے ہیں کہ ناقص ہے ہر اک رسمِ کہن
سابق انداز سے تنظیمِ ریاست نہ رہے
لحظہ لحظہ متغیر ہیں زمین اور زماں
کل جو تھا آج وہ آئینِ سیاست نہ رہے

ادبِ نو کے تقاضے بھی کچھ ایسے ہیں کہ اب
کہنہ قدروں کے پرستار نہیں جی سکتے
ہنس کے کہتی ہے یہ برنائیِ افکارِ جدید
اے قدامت تیرے بیمار نہیں جی سکتے

پھر بھی کچھ بات ہے یہ محض عقیدت ہی نہیں
لطف دیتا ہے ہمیں عُرفی و طالب کا کلام
مارکس کی مہر نہیں اس پہ مگر اس پہ بھی
رُوح افزا و دل افروز ہے غالب کا کلام

١٩٤٩

میکدہ

دکھا وہ میکدہ مجھ کو بھی آج پیرِ مغاں
ہزار صومعے جس میکدے پہ ہیں قُرباں
وہ میکدہ وہ شعور و خرد کی مے کا امیں
کہ دھوئی جاتی ہے جس میں حماقتِ انساں
بجائے شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں
بجائے عود مہکتا ہے جس میں سوزِ نہاں
وہ میکدہ کہ جہاں رُوحِ آدمیت ہے
وہ میکدہ کہ جہاں تازہ ہوتے ہیں ایماں

وہ میکدہ کہ ہے ظلماتِ جہل سے محفوظ
وہ میکدہ کہ جہاں مہرِ عقل ہے تاباں
جہاں بگوشۂ یک جام وسعتِ عالم
جہاں بگوشۂ یک دل فضائے کون و مکاں

۱۹۴۹

پریوں کا دیس

(بچّوں کے لئے)

جو باغ میں چھپ کر آتی ہیں
جو سُندر پھُول کھِلاتی ہیں
جو ناچتی ہنستی گاتی ہیں
اُن پریوں کا ہے دیس کہاں

بادل کی سواری کرتی ہیں
بجلی کی چمک پر مرتی ہیں
جو رنگ دھنک میں بھرتی ہیں
اُن پریوں کا ہے دیس کہاں

دریا کا بھنور پربت کی گپھا
صحرا کی ہوا، جنگل کی فضا
یہ سب دیتے ہیں جن کا پتا
ان پریوں کا ہے دیس کہاں

آموں کے پیڑوں سے اُڑ کر
تالاب کنارے پیپل پر
جو تھال بجاتی ہیں اکثر
ان پریوں کا ہے دیس کہاں

۱۹۴۴

ہولی

سحرِ موسیقی ہُوا پھر گونج اُٹھے گوکل کے بن
رقص فرمانے لگی پھر وادیٔ گنگ و جمن

پھر شبابِ مست نکلا مُل کے چہرے پر گلال
پھر نکھر آیا بہارِ لالہ سے حُسنِ چمن

پھر ہوائے تند لے کر آئی ہولی کی بہار
ہاتھ میں پچکاریاں لے کر چلے پھر مرد و زن

پھر جنونِ زندگی کو مل گیا نامِ سُرور
پھر نظر آنے لگا ہر سادگی میں بانکپن

ڈھولکیں باجے مجیرے اور کھڑتالیں عجیب
پھر فضائیں ہو گئیں بنسی کی لَے سے نغمہ زن

رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں گوپیاں سر تا قدم
اودے اودے۔ پیلے پیلے، نیلے نیلے پیرہن

۱۹۴۶

لالہ کرم چند ایڈیٹر پارس لاہور

میدانِ صحافت میں کئی پیل تن آئے
شہ زور مگر اِن میں ہیں لالائے کرم چند
ہوتے ہیں خوش افکارِ شاعر یہ بہت خوش
گو بہرِ تخلّص بھی تخلّص نہیں خورسند
اِخلاص ہے یہ ہندو و مسلم میں نہیں فرق
ایمان ہے یہ ایک ہیں دہلی و سمر قند

کھانے میں مجاہد ہیں تو پینے میں ہیں زاہد
کھاتے نہیں یہ چاٹ کے بدلے میں قلاقند

ککڑی کا بھی ہے شوق تو کھیروں سے بھی رغبت
تربوز اڑانے میں ہیں لاریب ہنرمند

خود اپنی تواضع میں بھی پیچھے نہیں رہتے
مہماں کی تواضع کے بھی مشتاق ہیں ہر چند

سوجھی ہے بڑھاپے میں انہیں فلم پرستی
اب ان کو جنوں کوش کہیں ہم کہ خردمند

القصہ مثال ان کی نہ ڈھونڈے سے ملے گی
لالائے کرم چند ہیں لالائے کرم چند

۱۹۴۶

دوسرا دور

۱۹۴۵ — ۱۹۳۶

غزلیں

اک اشکِ ندامت سُنتے ہیں سو داغِ کدورت دھوتا ہے
لیکن ہے یہاں تو یہ عالم یہ جی کو اور ڈبوتا ہے

طوفانِ بلا کا خوف نہیں یہ شانِ تغافل کیا کہنا
اے اہلِ وطن تم ہنستے ہو اور ایک زمانہ روتا ہے

گو فصلِ خزاں ہے پھر بھی تو کچھ پھول چمن میں باقی ہیں
اے ننگِ چمن تو اِس پر بھی کانٹوں کے ہار پروتا ہے

انجامِ عمل کی فکر نہ کر، ہے ذکر بھی اس کا ننگِ عمل
جو کرنا ہے تجھ کو کر لے وہ ہونے دے جو ہوتا ہے

طوفانِ مصیبت تیز سہی، لیکن یہ پریشانی کیسی
کشتی کو بیچ سمندر میں کیوں اپنے آپ ڈبوتا ہے

ہم ضبط کی منزل کے راہی فریاد کا دامن چھوڑ چکے
یہ اشکِ سرِ مژگاں لیکن کیوں راہ میں کانٹے بوتا ہے

اِس کی نہ سُنوں تو بھی ہے ستم اُس کی نہ سنوں تو بھی ہے غضب
جان اپنا رونا روتی ہے دل اپنا رونا روتا ہے

اے عرشؔ تلاشِ منزل میں انجامِ دل کی فکر نہ کر
گُم ہونا شانِ دل ٹھہری ہونے دے اگر گُم ہوتا ہے

۱۹۴۵

اپنی نظر میں آپ کو رُسوا کیا تو کیا
رو رو کے دردِ دل کا مداوا کیا تو کیا

اپنی نگاہِ شوخ سے چھُپیئے تو جانیئے
محفل میں ہم سے آپ نے پردا کیا تو کیا

چُپ ہو رہا جہاں مجھے دیوانہ جان کر
ہنگامہ کوئی شوق نے برپا کیا تو کیا

سوچا تو اس میں لاگ شکایت کی تھی ضرور
در پر کسی کے شکر کا سجدا کیا تو کیا

اپنے ہی ضبطِ خام کی تشہیر ہو گئی
ہم نے کسی کے ظلم کا چرچا کیا تو کیا

اشکوں سے اور ہو گیا مبہم بیانِ عشق
یوں فاش ہم نے رازِ تمنّا کیا تو کیا

جس ٹیس میں مزا تھا ہمیں وہ بھی اب نہیں
زخمِ جگر کو آپ نے اچھا کیا تو کیا

دنیا میں ذکرِ دوزخ و جنّت فضول ہے
عقبیٰ کو بات بات میں رُسوا کیا تو کیا

ترکِ اُمید ہی سے ملے گا سکونِ دل
دو دن کی زندگی پہ بھروسا کیا تو کیا

اے شیخ پی رہا ہے تو خوش ہو کے پی اسے
اِک ناگوار شے کو گوارا کیا تو کیا

اب تو یہ دردِ عشق مری زندگی ہے عرشؔ
اب اُس نے دردِ عشق کا چارا تو کیا

۱۹۴۴

ہیں ایسے بد حواس ہجومِ بلا سے ہم
اپنا سمجھ کے ملتے ہیں ہر آشنا سے ہم

طوفان سے اُلجھ گئے لے کر خدا کا نام
آخر نجات پا ہی گئے نا خدا سے ہم

پہلا سا وہ جنونِ محبت نہیں رہا
کچھ کچھ سنبھل گئے ہیں تمہاری دعا سے ہم

یوں مطمئن سے آئے ہیں کھا کر جگر پہ چوٹ
جیسے وہاں گئے تھے اسی مدعا سے ہم

آنے دو التفات میں کچھ اور بھی کمی
مانوس ہو رہے ہیں تمہاری جفا سے ہم

خوئے وفا ملی دلِ درد آشنا ملا
کیا رہ گیا ہے اور جو مانگیں خدا سے ہم

عادت سی ہو گئی ہے شکایات کی ہمیں
بیزار تو نہیں ہیں تمہاری جفا سے ہم

پائے طلب بھی تیز تھا منزل بھی تھی قریب
لیکن نجات پا نہ سکے رہنما سے ہم

دنیا سے کچھ لگاؤ نہ عقبیٰ کی آرزو
تنگ آ گئے ہیں اِس دلِ بے مدعا سے ہم

ہوتے نشاطِ عشق سے بھی فیض یاب عرشؔ
مجبور ہیں مگر دلِ غم آشنا سے ہم

۱۹۴۴

گوشمالِ حال اُن کا کرم بھی نہیں ہوتا • لیکن یہ ستم ہے کہ ستم بھی نہیں ہوتا

بڑھتا نہیں گو دردِ محبت مرے دل میں
لیکن یہ مصیبت ہے وہ کم بھی نہیں ہوتا

ناکامیٔ پیہم سے ہے مانوس مرا دل
اب تو مجھے اس بات کا غم بھی نہیں ہوتا

اُٹھتا ہے اگر سر ترے در سے تو گلہ کیوں
یہ غیر کے دروازے پہ خم بھی نہیں ہوتا

زاہد کے فسانوں میں تصنّع بھی نہیں کچھ
دل مائلِ حورانِ ارم بھی نہیں ہوتا

اللہ رے تلوّن کہ مرا دیر نشیں دل
بیگانۂ آئینِ حرم بھی نہیں ہوتا

یا شکوۂ اربابِ ستم تھا مجھے ہر دم
یا شکریۂ اہلِ کرم بھی نہیں ہوتا

۱۹۴۴

زندگی مستِ مئے دید ہوئی جاتی ہے
مژدہ اے دل کہ تری عید ہوئی جاتی ہے

یاس اب رَوِشِ اُمید ہوئی جاتی ہے
درد سے عیش کی تمہید ہوئی جاتی ہے

زندگی صرفِ غمِ دید ہوئی جاتی ہے
ہر گھڑی شوق کی تجدید ہوئی جاتی ہے

بڑھتا جاتا ہے مرا ذوقِ طلب فرقت میں
دشمنِ دل مری اُمید ہوئی جاتی ہے

غم کا چارا نہ رہا صبر کا یارا نہ رہا
اس پہ بھی ضبط کی تاکید ہوئی جاتی ہے

کیوں ترے لب پہ ہے عرشؔ اُن کی جفاؤں کا گلہ
دعویٔ ضبط کی تردید ہوئی جاتی ہے

۱۹۴۳

خوب تاثیرِ مئے سرجوش ہے
میکدے کا میکدہ بے ہوش ہے

اور اسے ساقی پلا تھوڑی سی اور
ہاں ابھی تھوڑا سا مجھ کو ہوش ہے

کون پروانے پہ ہوگا اشک بار
شمع بھی اے صبح اب خاموش ہے

کس نے لیں یہ باغ میں انگڑائیاں
گریۂ شبنم تبسّم کوش ہے

بے خودی اور اس پہ زعمِ آگہی
زندگی کیا ہے فریبِ ہوش ہے

شاعری اس کے لئے ہے گھر کی بات
عرشؔ فرزندِ جنابِ جوشؔ ہے
۱۹۴۳

عاشقی میں غمِ مآل ہی کیوں
دل کو یوں زحمتِ خیال ہی کیوں

زندگی واقعی مصیبت ہے
اس میں بے سُود قیل و قال ہی کیوں

اچھے ہو کر جو اور گھرے ہُوں
ایسے زخموں کا اندمال ہی کیوں

سانحہ ہی سہی شکستِ وفا
لیکن اس بات کا ملال ہی کیوں

دل کی فطرت ہے اضطراب پسند
اس سے تسکین کا سوال ہی کیوں

باکمالوں کو پوچھتا ہے کون — اِس قدر حسرتِ کمال ہی کیوں
عشق میں بحثِ جبر و صبر نہ چھیڑ — یہ مسائل یہ قیل و قال ہی کیوں
جس سے خود آپ مات کھا جائیں — بازیٔ عشق میں وہ چال ہی کیوں
جب نہیں کچھ جواب کی اُمید
عرشؔ پھر جرأتِ سوال ہی کیوں
۱۹۴۳

دل میں ترا غم ہے تو غمِ دہر نہیں ہے — اک طرفہ عنایت ہے ترا قہر نہیں ہے
کھلتے ہوئے ہر پھول سے کہتی ہے یہ شبنم — ہنسنے کی جگہ غمکدۂ دہر نہیں ہے
باقی نہیں اب دل میں اُمیدوں کی تڑپ بھی — یہ بحر وہ ہے جس میں کوئی لہر نہیں ہے
کس صاحبِ تقدیر پہ ہے اب یہ عنایت — اب میری طرف کیوں نگہِ قہر نہیں ہے
مے پینے میں اے شیخ تامّل نہیں اچھا — گو تلخ ہے قدرے یہ مگر زہر نہیں ہے
مے چھپ کے نہ پیتے ہوں جہاں صاحبِ تقویٰ — ایسا بھی تو دُنیا میں کوئی شہر نہیں ہے
دو چار پیالوں سے تو نیّت نہیں بھرتی — میخانہ وہ کیا مے کی جہاں نہر نہیں ہے
اے عرشؔ وفادار رہا کس کا زمانہ
خسرو نہیں دُنیا میں منوچہر نہیں ہے
۱۹۴۳

خزاں نصیب دلِ پُر محن ہزار رہے — مگر نگاہ میں رنگینیٔ بہار رہے
جوابِ میکدہ یوں بن گئے ترے میکش — سبُو بدوش رہے شیشہ در کنار رہے
ہزار پند و نصائح سنا چکا واعظ — جو بادہ خوار تھے وہ پھر بھی بادہ خوار رہے
یہ سادگی تھی کہ ہم اتنے پُر خطا ہو کر — تری نگاہِ کرم کے اُمیدوار رہے
اِدھر یہ شیان کہ اک آہ لب تک آ نہ سکی — اِدھر یہ حال کہ پہروں وہ اشکبار رہے
فنا پذیر اگر ہے بہارِ حسن و شباب — ہمارا عہدِ محبت ہی استوار رہے

زمانے کو یہ توہم کہ ہم ہوئے ناکام
ہمیں یقین کہ ہم شاد و کامگار رہے ۱۹۴۳

غیب سے ہو ہی جائے گی تائید — آپ کرتے رہیں مری تردید
آرزو کا بدل گیا مفہوم — خوب کی خوب یاس نے تنقید
پھر ہوا ختم اُن کا عہدِ وفا — پھر مرے شوق کی ہوئی تجدید
رمضاں سال بھر جو تم نہ ملو — تم جو مل جاؤ پھر ہے عید ہی عید

اِس کی تکمیل اور کون کرے
جس فسانے کی تجھ سے ہے تمہید

ہاں ٹھہر اے اجل کہ آ پہنچی
ان کے آنے کی جاں نواز نوید

زندگی تجھ سے ہے سکوں تجھ سے
تو مری جان تو مری اُمید

آ کہیں اے نویدِ راحتِ دل
تجھ سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی نوید

جس نے دیکھا اُسے وہی جانے
کیا کہیں عرش فرقِ دید و شنید ۱۹۴۳

جب مٹا خوف زمانے کے بدل جانے کا
لُطف ہر گھونٹ میں آنے لگا پیمانے کا

درس دیتا ہے زمانے کو سنبھل جانے کا
قابلِ دید ہے عالم ترے دیوانے کا

ذکرِ بربادئ عالم پہ ہے پُر نم ہر آنکھ
یہ بھی اک جزو ہے شاید مرے افسانے کا

تو نے جو بند کئے کھول دئے اُس نے وہ راز
تجھ سے بھی بڑھ کے ہے رتبہ ترے دیوانے کا

زندگی کشمکشِ عشق کے آغاز کا نام
موت انجام اسی درد کے افسانے کا

مجھ سے اِس دل کی ذرا شانِ جمالی پوچھو
جس پہ ہوتا ہے گماں سب کو سیہ خانے کا

عرش اس میں بھی ہے در پردہ خرابی کوئی
طواف کرتی ہیں بہاریں مرے ویرانے کا ۱۹۴۳

جب خموشی سے بیانِ مدّعا کرتے ہیں ہم
ایک ہنگامہ زمانے میں بپا کرتے ہیں ہم

تیرے تیروں کے لئے کچھ تو نشانہ چاہیئے
مژدہ باد اے نامرادی پھر دعا کرتے ہیں ہم

ایک ہُو سے پھاند جاتے ہیں خرد کی منزلیں
یوں جنونِ نرم رو کو برق پا کرتے ہیں ہم

خود فریبی خود فریبی ہے مگر اتنی بھی کیا
راہزن پر بھی گمانِ رہنما کرتے ہیں ہم

جانتے ہیں عرش دُنیا ہے بُتوں کی جلوہ گاہ
اس پہ بھی نامِ خدا ذکرِ خدا کرتے ہیں ہم

۱۹۴۳

پھر بہار آئی خیالِ دورِ جام آ ہی گیا
پھول کا ساغر کا میرے لب پہ نام آ ہی گیا

ہو گیا آخر محبت آفریں اُن کا شباب
جس جگہ لُٹتی ہے دُنیا وہ مقام آ ہی گیا

دل ہوائے عیش میں اُڑ کر ہُوا پابندِ غم
طائرِ آزاد آخر زیرِ دام آ ہی گیا

جا نہیں سکتی مرے دل سے خلش امید کی
وہ نہیں آئے مگر ان کا پیام آ ہی گیا

لاکھ خورشیدِ محبت کی ضیا پاشی رہی
میری صبحِ آرزو پہ رنگِ شام آ ہی گیا

گو صفِ آخر میں ہم مایوس سے بیٹھے رہے
فیضِ ساقی سے مگر ہم تک بھی جام آ ہی گیا

ننگِ میخانہ تھیں ساقی کی ادب آموزیاں
لب پہ رندوں کے سوالِ اذنِ عام آ ہی گیا

غنچہ و گل کا سکوں پامال ہو جائے گا اب
جانبِ گلشن کوئی محشر خرام آ ہی گیا

جس جگہ اے عشق رہ جائیں گے تھک کر ہم سفر
شکر کرتا ہوں کہ آخر وہ مقام آ ہی گیا

۱۹۴۳

دُنیا نے ہم سے مول لیا بَیر کس لئے
ہیں بہرہ یابِ عیش و طرب غیر کس لئے

سجدوں کا حکم اے بُتِ کافر نہ دے ہمیں
چُومے تجھے بار بار ترے پَیر کس لئے

اے شیخ بُت کدے کی مذمّت ہے کیا ضرور
کعبے کے غم کے ساتھ غمِ دیر کس لئے

دامانِ گل ہے چاک تو غنچے خزاں نصیب
گلزارِ زندگی کی کریں سیر کس لئے

اے خود فریبئ دلِ بے خود بتا بھی دے
اپنوں کو ہم سمجھتے رہے غیر کس لئے

۱۹۴۳

وہ منانے سے بھی ملُول ہُوا
یہ فسانہ بھی آج طُول ہُوا

جان بھی نذرِ دوست کر دیں گے
ہدیۂ دل اگر قبول ہُوا

بارگاہِ خزاں میں ایک ہیں سب — کوئی کانٹا ہُوا کہ پھول ہُوا
داغ بن کر رہا وہ دل میں مرے — جو چمن میں گیا تو پھول ہُوا

عرش سمجھوں گا اُن کی چوکھٹ کو
میرا سجدہ اگر قبول ہُوا

۱۹۴۲

ہمیں ہیں تمہارے ستم سہنے والے — ہمیں ہیں ستم کو کرم کہنے والے
نشانِ تمنّا بھی پاتے نہیں اب — کسی کی تمنّا میں گم رہنے والے
محبّت کی باتوں کی حد بھی ہے کوئی — کہاں تک کہیں رازِ دل کہنے والے
سکوں آشنا ہو گئے رفتہ رفتہ — تمہاری جدائی کا غم سہنے والے
پیامِ نظر کو وہ سمجھیں نہ سمجھیں — جو کہنا تھا وہ کہہ گئے کہنے والے
مری بزمِ خلوت کی رونق بنے ہیں — ہمیشہ سرِ بزم چُپ رہنے والے
تعجّب ہے تجھ کو خدا مانتے ہیں — خُدا کو بہ دقّت خدا کہنے والے
بہت مصلحت کوشیوں سے ڈرایا — نہ روکے سے ہرگز رُکے کہنے والے
تمہیں کو پشیمان ہونا پڑے گا — ستم سہہ ہی لیں گے ستم کہنے والے

مشیت سے منکر نہیں ہیں تو کیا ہیں — غمِ زندگی کو بُرا کہنے والے

تصور میں پیش نظر ہیں وہ عالم

چھپیں گے کہاں عرشؔ پردہ ہٹنے والے

۱۹۴۱

اے یاس مرا گھر ترا مسکن تو نہیں ہے — دِل ہے یہ تمنّاؤں کا مدفن تو نہیں ہے

کیا بات ہے گُل زار ہے کیوں برق سے محفوظ — بے برگ مری شاخِ نشیمن تو نہیں ہے

ہاں دیدۂ تحقیق سے اے ذوقِ سفر دیکھ — رہبر جسے سمجھا ہے وہ رہزن تو نہیں ہے

تکلیفِ اسیری کی شکایت نہ کر اے دِل — یہ کُنجِ قفس کُنجِ نشیمن تو نہیں ہے

آؤ کہ تمنّاؤں میں ہے تابِ نظارہ — یہ دل ہے مرا وادیٔ ایمن تو نہیں ہے

چھو کر ہی جسے آتشِ دوزخ ہوئی ٹھنڈی — دامن یہ کسی رند کا دامن تو نہیں ہے

منظور ہے کچھ جانچ ترے عزم کی اس کو — دراصل زمانہ ترا دشمن تو نہیں ہے

بے سعیِ عمل خاک ہے انسان کا جینا — یہ رزمگہِ زیست ہے مدفن تو نہیں ہے

دیکھو تو رہا دشت نوردی پہ جو نازاں

وہ عرش رواں جانبِ گلشن تو نہیں ہے

۱۹۴۱

مے تو چشمِ ساقی سے ہر گھڑی برستی ہے
دل فسردہ طبعی سے خود ہی ننگِ مستی ہے

زاہدوں کی ہستی بھی کیا عجیب ہستی ہے
ذوقِ اتقا بھی ہے رُوح بھی ترستی ہے

میگساری و توبہ اک فریب ہیں دونوں
اصل میں مقامِ دل ہوش ہے نہ مستی ہے

کچھ قصور ساقی کا کچھ ہے ابر و باراں کا
قابلِ سزا ناحق جُرمِ مے پرستی ہے

میرے دل کی نیرنگی پُوچھتے ہو کیا مجھ سے
تم نہیں تو ویرانہ تم رہو تو بستی ہے

صبر کے خزانوں کو روز میں لٹاتا ہوں
سجدہ گاہِ اہلِ دل میری تنگدستی ہے

عرش اپنے دامن پر داغ یہ نہ آنے دے
دشمنِ سکونِ دل تیری زر پرستی ہے ۱۹۴۱

وہ حاضر ہو کہ غائب ہو نہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
سراسر رازِ کن فکاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

تحیّر ہے حضوری میں تو بے تابی ہے دُوری میں
مصیبت میں یہ جانِ ناتواں یوں بھی ہے اور یوں بھی

تمنّا کی طرح ترکِ تمنّا بھی مصیبت ہے
یہ دُنیا اکِ مقامِ امتحاں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

وُہ آکر بھی رُلاتے ہیں وُہ جا کر بھی رُلاتے ہیں
دلِ ناکام مشغولِ فغاں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

اٹھایا نازِ رہبر بھی جنوں بھی آزما دیکھا
مگر برہم نظامِ کارواں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

جو دل میں داغ روشن ہیں تو اشکِ خُوں ہیں آنکھوں میں
یہ منظر گلستاں در گلستاں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

فقط کہنے کو ہے یہ کامیابی اور ناکامی
محبّت فارغِ کون و مکاں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

ستم ہو یا کرم دونوں کا ہم پر شُکر واجب ہے
جو اپنا مہرباں ہے مہرباں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

گھٹا ساون کی اور اے عرشؔ الہامات کی بارش
زمیں پر آج فیضِ آسماں یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

۱۹۴۱

جگر کو دل کو لے کر ساتھ میرے اشکِ تر نکلے

مری جانِ حزیں بھی کاش بن کر ہم سفر نکلے

مثالِ برق ہی نکلے وُہ پردہ چھوڑ کر اپنا

اگر نکلے تو کیوں کر حسرتِ ذوقِ نظر نکلے

نقابِ رُخ اُلٹنے کو تو اُس نے بارہا اُلٹی

بُرا ہو اپنی حیرت کا کہ ہم خود کم نظر نکلے

اسیری سے نہیں کچھ کم رہائی ہم اسیروں کی

قفس کی قید سے نکلے بھی تو بے بال و پر نکلے

اثرؔ اُس بے وفا پہ ہو گیا ضبطِ محبّت کا

مرے روکے ہوئے آنسو ہی آخر کارگر نکلے

ابھی کرتا ہوں اک ہچکی سے چارہ دردِ پنہاں کا

یہ کیوں مایوس ہو کر میرے گھر سے چارہ گر نکلے

اُمیدیں باعثِ آزارِ جاں جن کو سمجھتی تھیں

وہی نالے دفورِ یاس میں فرحت اثر نکلے

کہیں اے عرشؔ کیا بے گانگی شوقِ محبّت کی
ہم اُن سے بے خبر نکلے وہ ہم سے بے خبر نکلے

۱۹۴۰

نہیں ہے راز کوئی راز دیدور کے لئے
نقاب پردہ نہیں شوق کی نظر کے لئے

ترے سوا کوئی سودا نہیں ہے سر کے لئے
جبیں ہے وقف فقط تیرے سنگِ در کے لئے

فریبِ راحتِ منزل میں کھا نہیں سکتا
ہُوا ہوں گرم سفر کلفتِ سفر کے لئے

یہ رو چکی ہے تو کیا اُن کو بھی رُلانا ہے
بہت سا کام ابھی باقی ہے چشمِ تر کے لئے

یہ میری آنکھ سے تیرا حجاب کیا معنی
نظر ہے تیرے لئے اور تو نظر کے لئے

اسی کا نام ہے انجام عاشقی شاید
تڑپ رہے ہیں جو اک لطف کی نظر کے لئے

نہ آئے عرشؔ مرے لب پہ اب دعائے سحر
مری سحر ہے فقط نالۂ سحر کے لئے

۱۹۴۰

دنیا سے غرض ہے نہ ہمیں دین سے مطلب
اک تجھ سے سروکار ہے معلوم نہیں کیوں

وہ عشق جو تھا گرمیٔ بازارِ جوانی
رسوا سرِ بازار ہے معلوم نہیں کیوں

وہ دل جو تھا اُمید و تمنّا کا سہارا
گرتی ہوئی دیوار ہے معلوم نہیں کیوں

بیمارِ محبت کہ ہو تم جس کے مسیحا
جینے سے ہی بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

تُو دل کا خریدار ہُوا اور نہ ہوگا
دِل تیرا خریدار ہے معلوم نہیں کیوں

اقرار سے دیتے تھے کبھی طفل تسلّی
اب اس سے بھی انکار ہے معلوم نہیں کیوں

جیتے رہے ہم عرش فقط نام پہ ان کے
اب حسرتِ دیدار ہے معلوم نہیں کیوں

۱۹۴۰

خودی کا رازداں ہو کر خودی کی داستاں ہو جا
جہاں سے کیا غرض تجھ کو تو آپ اپنا جہاں ہو جا

بیانِ پائمالی شکوۂ برقِ تپاں ہو جا
گلستانِ جہاں کے پتّے پتّے کی زباں ہو جا

شریکِ کارواں ہونے کی گو طاقت نہیں تجھ میں
مگر اتنی تو ہمت کر کہ گردِ کارواں ہو جا

تزلزل سے بری ہو تیرا استقلال اُلفت میں
یقینِ پر یقیں ہو جا، گمانِ بے گماں ہو جا

کسی صورت تو شرحِ آرزوئے شوق کرنی ہے
زباں چُپ ہے اگر اے دل تو آپ اپنی زباں ہو جا
زمانے پر بھروسا کر نہ رازِ عشق کا اے دل
جہاں تک ہو سکے تو آپ اپنا رازداں ہو جا
بلندی نام سے اے عرشؔ مل سکتی نہیں تجھ کو
زمینِ شعر پر اَوجِ سخن سے آسماں ہو جا

۱۹۴۰

دل ہے لیکن دل میں کوئی غم نہیں
یہ مصیبت بھی تو آخر کم نہیں

داغ ہیں دل میں مگر آنکھیں ہیں خشک
پھُول یہ شرمندۂ شبنم نہیں

زینتِ محفل ہے تو بے شک مگر
بزم وہ کیا بزم جس میں ہم نہیں

دل ہے جس کا ساغرِ گیتی نما
کچھ اُسے پروائے جامِ جم نہیں

کس کو دُنیا میں ہوئی راحت نصیب
کون دُنیا میں اسیرِ غم نہیں

ہر بلائے غم پہ دل روتا رہا
اب تو اپنا بھی اُسے ماتم نہیں

موت اچھی اس اُمید و بیم سے
مجھ پہ اُن کے جَور بھی پیہم نہیں

عرشؔ کے نالے بھی ہیں جدّت پسند
رو رہا ہے آنکھ بھی پُر نم نہیں

تصویرِ دوست دل میں کچھ ایسے اُتر گئی
جھولی مری مُراد کے پھولوں سے بھر گئی

ہے بے نیازِ شکوۂ تقدیر غم مرا
جس ڈھنگ سے گزر گئی اچھی گزر گئی

اُٹھنے پہ بھی نہ اُٹھ سکی اُن کی نقابِ رُخ
اُلٹا مری نگاہ پہ الزام دھر گئی

سَو سَو سزائیں عشق میں اک گناہ پر
کچھ تو بتا مجھے تری رحمت کدھر گئی

آزارِ زیست ہجر میں حد سے گزر گیا
کیا جانے میری موت کہاں جا کے مر گئی

صیّاد نے اجازتِ پرواز دی تو کیا
قوّت ہی بال و پر کی جو پروا نہ کر گئی

دولت نہیں نصیب تو اس کا گلہ ہی کیا
ناداریوں کے فیض سے نیّت تو بھر گئی

اُن کے بگاڑ میں ہے محبّت کا شائبہ
اے عرشؔ تو سمجھ مری بگڑی سنور گئی

۱۹۴۰

چمن سے سُوئے میخانہ ہوائے خوشگوار آئی
اُٹھا اب جام لے ساقی بہار آئی بہار آئی

سبُو بردوش آئی اور مینا در کنار آئی
سراپا میکدہ بن کر گلستاں میں بہار آئی

وہ آئے یا نویدِ رحمتِ پروردگار آئی
مرے اُجڑے ہوئے دل کے گلستاں میں بہار آئی

زمانے نے کیا ہے پاس کس کی تاجداری کا
سکندر بھی تو دو دن کر گیا دنیا میں دارائی

نیازِ عشق بھی اُن میں ہے، نازِ حُسن بھی اُن میں
نہ ہے اندازِ خود بینی نہ ہے شانِ خود آرائی

توازن خوب یہ عشق و سزائے عشق میں دیکھا
طبیعت ایک بار آئی مصیبت بار بار آئی

نہ کیوں ماتم کروں میں زندگی کی سادہ لوحی کا
بساطِ عشق پر کمبخت نقدِ دل بھی ہار آئی

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ اندازِ کرم تیرا
تری محفل سے جب آئی محبّت سوگوار آئی

فریبِ آرزو پُر لطف ہے ترکِ تمنّا سے
سکوں افزائے دل ہے عشق کی ہنگامہ آرائی

سہارا موت نے آکر دیا تو کب دیا ہم کو
ہماری زندگی جب دن مصیبت کے گزار آئی

تصدّق کر دیا اے عرش سر جب اُن کے قدموں پر
محبّت بول اُٹھی میں آج بارِ دوش اُتار آئی

۱۹۳۹

مسکن ہے اُن کا وسعتِ کون و مکاں سے دُور
ہاں اس قدر کہ ہے مرے وہم و گماں سے دُور

آتا ہے رشک مجھ کو قفس میں بھی برق پر
وہ آشیاں کے پاس ہے میں آشیاں سے دُور

ذوقِ سجود میں مری مجبوریاں نہ پُوچھ
دل آستاں کے پاس ہے سر آستاں سے دُور

دل نذرِ ذوقِ چشمِ تماشا نہیں ہُوا
اچھا ہُوا یہ پھُول کِھلا گلستاں سے دُور

اس کیفیت پہ عُمر کی سب راحتیں نثار
تُو میرے پاس اور میں سارے جہاں سے دُور

ایک اور ہی چمن ہے تصوّر میں رات دِن
میں آشیاں میں رہ کے بھی ہوں آشیاں سے دُور

اے عرش ان کی شعبدہ بازی تو دیکھنا
دل کے قریب رہ کے ہیں وہم و گماں سے دُور

۱۹۴۳

سکون بخشِ طبیعت ہیں دعائیں بے اثر ہو کر
ہمارے عیب بھی چمکے زمانے میں ہنر ہو کر

کمالِ ہمّت دل پر جنوں میں رشک ہے مجھ کو
خرد کی منزلیں طے کر گیا آشفتہ سر ہو کر

ہوا کا ایک جھونکا تجھ کو جب چاہے بجھا ڈالے
یہ کیا جینا ہے دُنیا میں چراغِ رہگذر ہو کر

شعارِ شمع ہے خاموش رہنا اور جل جانا
اسے معلوم ہے حاصل نہیں کچھ نوحہ گر ہو کر

پرِ پرواز دشمن تھے نشیمن زادِ طائر کے
بڑھا شوقِ گرفتاری طلسمِ بال و پر ہو کر

ہُنر ور کے لئے رُسوائیاں ہیں اس زمانے میں
نگاہِ اہلِ عالم سے چھُپو صاحبِ ہُنر ہو کر

بڑھی ہے سرگرانی اور بھی ضبطِ محبّت سے
ہوئی کچھ اور لمبی یہ کہانی مختصر ہو کر

مجالِ گفتگو پاؤں میں شاید اس بہانے سے
چلا ہوں اُن کے در تک آپ اپنا نامہ بر ہو کر

تلاشِ منزلِ جاناں میں جب اے عرش میں نکلا
چلی گم گشتگی بھی ساتھ میرے ہم سفر ہو کر

۱۹۴۰

وہم عین الیقیں نہ ہو جائے — اُن کی ہاں بھی نہیں نہ ہو جائے
اب ہوا میں ہے اِک جہاں آباد — آسماں ہی زمیں نہ ہو جائے
دِل ہے مائل نشاطِ دُنیا پر — زہر یہ انگبیں نہ ہو جائے
رُک رہا ہے اب انتظار میں دم — یہ دمِ واپسیں نہ ہو جائے
بچ گیا دل فریبِ دُنیا سے — اب گرفتارِ دیں نہ ہو جائے
ہو کے خم آستانِ دولت پر — کہیں رُسوا جبیں نہ ہو جائے
نگہِ مہرباں معاذ اللہ — نگہِ خشمگیں نہ ہو جائے

چھوڑ اسے عرش طولِ وصفِ جمال
بدگماں وہ کہیں نہ ہو جائے

۱۹۳۹

درد کی ابتدا بھی ہے ضبط کی انتہا بھی ہے
قطرۂ اشک آنکھ میں آ کے رُکا ہُوا بھی ہے

راہِ وفا میں ہر جگہ کھا نہ فریبِ زندگی
دیکھ کہ اس مقام پر سجدۂ دل روا بھی ہے

اے دلِ کم نظر ذرا اس پہ بھی کچھ نظر رہے
دشمنِ مدّعا ہے جو خالقِ مدّعا بھی ہے

ان کے حجاب کا گلہ تیری زباں پہ ہے عبث
تیری نگاہِ شوق کا پردہ کبھی اُٹھا بھی ہے

اے غمِ ابتدا سلام اس میں نہیں کوئی کلام
میری نگاہِ دُور بیں واقفِ انتہا بھی ہے

یُوں تو بقولِ خود ہے تُو عرش سے بھی بلند تر
کہتے ہیں لوگ کیا تجھے تو نے کبھی سُنا بھی ہے

۱۹۳۹

حدیثِ شوق کی ہوتی رہیں گو لاکھ تفسیریں
مگر باتوں سے کٹ سکتی ہیں کب قوموں کی زنجیریں

تری دُنیا کو اے واعظ مری دنیا سے کیا نسبت
تری دُنیا میں تقدیریں مری دُنیا میں تدبیریں

بدل جانے کو ہے نقشہ بساطِ بزمِ عالم کا
وہی دَور آ رہا ہے دیکھتے تھے جس کی تصویریں

فرشتوں کو مرے نالے وغیرہ بدنام کرتے ہیں
مرے اعمال لکھتے ہیں مری قسمت کی تحریریں

ضرورت مشعلِ راہِ محبّت کی نہیں اس کو
سوادِ عشق میں جس کو نظر آتی ہوں تنویریں

نہیں نشو و نمائے شوق بے حُسنِ عمل ممکن
خطیبِ بے عمل کرتا رہے گو لاکھ تقریریں

بنیں گی تازیانہ عرشؔ میرے عزمِ صادق کا
مری موہوم اُمیدیں مری ناکام تدبیریں

۱۹۳۹

تکمیلِ جنوں کر کے جو خاک بسر آیا
فرزانوں سے افضل وہ دیوانہ نظر آیا

اب اس سے سوا ہو گی محرومیٔ قسمت کیا
نالہ ترے در سے بھی محرومِ اثر آیا

دیتا ہوں دلاسے یوں ہنگامِ سفر دل کو
وہ منزلِ یار آئی وہ دوست کا گھر آیا

جو بات بھی تھی اُن کی تفصیہ کی طالب تھی
الزامِ سُخن سازی اُلٹا مرے سر آیا

احباب نے کی آکر فوراً مری دلجوئی
میں دورِ مصیبت سے جس وقت گزر آیا

میرا جو نہیں اپنا پیغام دیا ہوگا
قربان مرے قاصد کے کچھ کام تو کر آیا

شاید مرے رونے سے دل ٹوٹ گیا اُن کا
کچھ رحم نہ تجھ کو بھی اے دیدۂ تر آیا

اوروں سے سوا مجھ پر یہ خاص نوازش کیوں
یوں میں ہی ترے در سے با دیدۂ تر آیا

بخشی تھی حیا نے گو سُرخی رُخِ زیبا کو
در پردہ تبسم سے رنگ اور نکھر آیا

محرومِ نظارہ ہی حیرت سے رہی محفل
آنے کو تو محفل میں وہ شعبدہ گر آیا

یہ حال ہوا اُن کا سُن کر مرا افسانہ
آنکھ اشک سے بھر آئی دل درد سے بھر آیا
اے عرش اثر غم کا دل سے نہ گیا ہرگز
یہ داغ مٹا جتنا اُتنا ہی اُبھر آیا

1939

پژمردہ طبیعت کے لئے بادِ صبا ہے
افسردگیِ ہجر میں ساون کی گھٹا ہے
تسلیم پرستوں کے لئے رنجِ بلا ہے
غم ہے، الم ہے، ستم ہے، جفا ہے
تفریح کا ساماں ہی توجہ کے ہے قابل
بد ذوقیِ عالم سے ہے شاعر کی نوا ہے
کیا قدر ستم کش کی ستمگار کے دل میں
پتھر کا اگر دل ہو تو پھر بین و بکا ہے
جو خوگرِ نغمہ ہے وہ نالوں کو سُنے کیا
عشرت کدۂ دوست میں ہے آہ رسا ہے
دل خاک شگفتہ ہو مرا آتشِ غم میں
جل جائے کوئی باغ تو ساون کی گھٹا ہے
اے عرش یہ سچ کہہ گیا اک پیرِ طریقت
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

1939

رگ و پے میں سب کے سماتا چلا جا — محبت کا جادو جگاتا چلا جا

بلا سے اگر کوئی ناوکِ فگن ہے — تو اپنا جگر آزماتا چلا جا

اُسے دیکھنا ہے تو پھر وسوسے کیوں — یہ پردے ہیں ان کو گراتا چلا جا

مصیبت سے ڈرنے میں رسوائیاں ہیں — مصیبت میں بھی مسکراتا چلا جا

یگانے تو اپنے نہیں بن سکیں گے — تو غیروں کو اپنا بناتا چلا جا

نہ سُر ہو پرانا نہ لَے ہو پرانی — نئی تال کے گیت گاتا چلا جا

نہیں تجھ کو زیبا قدامت پرستی — رسومِ کہن کو بھلاتا چلا جا

تری دور بینی پہ دنیا فدا ہو — ہر اک بات کا بھید پاتا چلا جا

زمانے کو اے عرشؔ زیرِ نگیں کر
محبت کا پرچم اُڑاتا چلا جا

۱۹۳۰

سب دیکھنے والے اِنہیں غش کھائے ہوئے ہیں — اس پر بھی تعجب ہے وہ شرمائے ہوئے ہیں

اک تیری محبت کی قسم کھائے ہوئے ہیں — تو غیر سہی ہم تجھے اپنائے ہوئے ہیں

اے جانِ جہاں ہم کو زمانے سے غرض کیا
جب کھو کے زمانے کو تجھے پائے ہوئے ہیں

داغوں پہ چمک ہے نہ ہے زخموں پہ تبسّم
سب پھول مرے باغ کے مرجھائے ہوئے ہیں

حیراں ہوں کیوں مجھ کو دکھائی نہیں دیتے
سنتا ہوں مری بزم میں وہ آئے ہوئے ہیں

نسبت کی یہ نسبت ہے شرف کا یہ شرف ہے
تیرے ہیں اگرچہ ہم تیرے ٹھکرائے ہوئے ہیں

تحریک ہے پینے کی مجھے اُن کی طرف سے
بادل کی طرح دل پہ مرے چھائے ہوئے ہیں

ہے دیکھنے والوں کو سنبھلنے کا اشارہ
تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں

کچھ ڈھونڈتے ہیں خود بھی ہم اے عرشؔ کسی کو
کچھ اپنے خیالوں کو بھی دوڑائے ہوئے ہیں

۱۹۳۸

اس کی جفا جفا نہیں اس کو نہ تو جفا سمجھ
حُسنِ جہاں فریب کی یہ بھی کوئی ادا سمجھ

خود کو غم آفریں سمجھ اُس کو تو غم رُبا سمجھ
حُسن کو فتنہ زا نہ کہہ عشق کو فتنہ زا سمجھ

داغِ فراقِ عشق کو آتشِ سوزِ دل نہ کہہ
یہ بھی کسی کے حُسن کا جلوۂ پر ضیا سمجھ

دِل میں وہ تیرے ہے مکیں دل سے ترے الگ نہیں
تجھ سے جُدا وہ لاکھ ہو تو نہ اُسے جُدا سمجھ

تجھ کو گناہِ عشق پر لاکھ کوئی بُرا کہے
تیرا بھلا اسی میں ہے تو نہ اُسے بُرا سمجھ

تُو جو کہے تو دل بھی دُوں، جان بھی دُوں جگر بھی دُوں
گو میں گدائے عشق ہوں مجھ کو نہ بے نوا سمجھ

زخمِ جگر جو مندمل غم میں نہیں ہُوا نہ ہو
درد کی انتہا کو تُو شوق کی ابتدا سمجھ

منزلِ راہِ عشق کی اس کو کوئی خبر نہیں
راہ دکھائے جو تجھے اس کو نہ رہنما سمجھ

۱۹۳۸

دل مرا تیرِ نگاہِ ناز کی منزل کہاں
میری قسمت میں حسابِ دوستاں دردِ دل کہاں

میری کشتی کو نہ موڑ اے ناخدا للہ نہ موڑ
حسرتِ گرداب ہے اب حسرتِ ساحل کہاں

جھک گئی نقشِ قدم پر جوشِ الفت سے جبیں
بیخودی میں اب تلاشِ جادہ و منزل کہاں

باندھتا ہے یہ تو لاکھوں ہی طلسمِ آرزو
یاس کے عالم میں لیکن اعتبارِ دل کہاں

میں سمجھتا ہوں اسے حسنِ نظر کا انتخاب
ورنہ دل اُن کے جفا و جور کے قابل کہاں

حیرتِ نظارہ سے یہ بھی خبر مجھ کو نہیں
میں کہاں ہوں، دل کہاں ہے، مدعائے دل کہاں

کہہ رہی تھی صبحدم یہ شمع کی افسردگی
سوزِ پروانہ نہ ہو تو گرمیٔ محفل کہاں

ڈھونڈ لوگے عرشؔ اُن کی جلوہ گاہِ ناز کو
تم کہاں، منزل کہاں، یہ دعویٔ باطل کہاں ۱۹۳۸

زخمِ دل بھی دکھا کے دیکھ لیا
بس تمھیں آزما کے دیکھ لیا

داغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی
یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا

شکوے مٹتے ہیں کیونکر آپ سے آپ
سامنے اُن کے جا کے دیکھ لیا

مژدہ اے حسرتِ دلِ پُر شوق
اُس نے پھر مُسکرا کے دیکھ لیا

لُطف جو بیخودی میں تھا وہ کہاں
ہوش میں ہم نے آ کے دیکھ لیا

نہ گئی اُن کی تمکنت نہ گئی
بارہا سر جُھکا کے دیکھ لیا

آبرو اور بھی ہوئی پانی
اشکِ حسرت بہا کے دیکھ لیا

ترکِ اُلفت کے سُن لیے الزام
رازِ دل کو چھپا کے دیکھ لیا

جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے
دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا

زندگی ہر طرح وبال رہی　　　　سبھی آزما کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرش

سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

۱۹۳۸

گلہ کیا اگر عمرِ فانی ملی ہے　　　　اسی سے تو مجھ کو جوانی ملی ہے

مرا مدّعا تو مرا منتہا تو　　　　ترے واسطے زندگانی ملی ہے

طبیعت پہ احساس ہے آنسوؤں کا　　　　انھیں سے تو اس کو روانی ملی ہے

جوانی کی خاطر ملی ہے محبّت　　　　محبّت کی خاطر جوانی ملی ہے

زمانہ تو ہے دشمنِ کامرانی　　　　مجھے حسرتِ کامرانی ملی ہے

وفا و جفا کا ہے پیوند ایسا　　　　کہانی سے گویا کہانی ملی ہے

گھٹاؤں سے گیسو بہاروں سے چہرا　　　　قیامت سے اُن کو جوانی ملی ہے

نگاہِ ہوس روک اے عشق اپنی　　　　تجھے حسن کی پاسبانی ملی ہے

بہاروں سے اے عرش اس کو غرض کیا

ازل سے جسے خونفشانی ملی ہے

۱۹۳۸

اڑ کر چمن میں پہنچوں کیا بات ہے یہ بس کی
میرے نصیب میں تو ہیں تیلیاں قفس کی

پھر میکدے پہ گھر کر ابرِ بہار آیا
پھر رٹ لگا رہے ہیں میکش برس برس کی

تنکے تو آشیاں کے سب تو نے پھونک ڈالے
اب خیر مانگتا ہوں اے برق میں قفس کی

مجھ جاں بلب کو ساقی دو گھونٹ تو پلا دے
گنتی نہ ہو سکے گی مجھ سے نفس نفس کی

اے کاروانِ ہستی عازم ہے تو کہاں کا
دھڑکن ہمارے دل کی آواز ہے جرس کی

انجامِ آشیاں پہ اے عرش آنکھ تر کیوں
ہے نذرِ برق ہونا تقدیر خار و خس کی

۱۹۳۸

مرے دل میں جب سے ترا غم مکیں ہے
مسرّت کی بھی کچھ تمنّا نہیں ہے

اسی کا فلک ہے، اسی کی زمیں ہے
یہ دُنیا محبّت کے زیرِ نگیں ہے

بہت دیر سے آستاں پر جبیں ہے
مگر تیرے لب پر ابھی تک نہیں ہے

نگاہوں کی گستاخیاں توبہ توبہ
کوئی آج پردے میں بھی شرمگیں ہے

ابھی تو تقاضا ہُوا ہی نہیں کچھ
پسینے سے تر کیوں تمہاری جبیں ہے

محبّت کی جو بات تھی دلنشیں تھی　　محبّت کی جو بات ہے دل نشیں ہے
محبّت اگر ہے تو سب کچھ ہے گھر میں　　محبّت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

کرامت سے خالی ہے جس کی محبّت
محبّت سے عرش اس کو نسبت نہیں ہے
۱۹۳۷

ملے جو گنجِ قناعت تو بے زری کیا ہے
قلندری ہے جو حاصل تو قیصری کیا ہے

دو روزہ شوکت و عظمت پہ بھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

نہیں جو دشمنِ ہوش و خرد جمال ترا
نظر نظر پہ یہ تیری فسوں گری کیا ہے

قدم قدم پہ زمانے نے مجھ کو ٹھکرایا
میں کیا کہوں کہ تری بندہ پروری کیا ہے

زمانے بھر کو دیا تم نے درس اُلفت کا
بھلا یہ کون سکھائے کہ دلبری کیا ہے

گلہ جو تم سے کیا ہے وہ ناروا ہی سہی
تمھیں کہو کہ تمہاری ستمگری کیا ہے

ترا شباب بھی ایماں شکن مجھے بھی غرور
یہ کافری جو نہیں ہے تو کافری کیا ہے

بنا بنا مجھے بے شک خراب حال بنا
مگر بتا کہ تری اس میں بہتری کیا ہے

قفس نصیب سے کیا پوچھتا ہے اے صیّاد
کہ آشیانے میں لطفِ نواگری کیا ہے

بہک گئے ہو مئے سبزہ فام سے اے عرش
شراب پی کے یہ لب پہ ہری ہری کیا ہے

۱۹۳۷

صنم خانے میں بھی شانِ خدا معلوم ہوتی ہے
نظر میری حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے

گماں ہوتا ہے جس پر نغمۂ جاں سوز کا سب کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا معلوم ہوتی ہے

تصنّع کی فسوں کاری کا کچھ ایسا اثر دیکھا
کہ یہ دُنیا مجھے دُنیا نما معلوم ہوتی ہے

بچھڑ کر قافلے سے بدحواس اِتنا ہُوا ہُوں میں
کہ ہر آواز اب بانگِ درا معلوم ہوتی ہے

جسے تُو انتہائے درد دل کہتا ہے اے ناداں
وہی شوقِ وفا کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

ہوائے برشگال آئی پلا اک جام اے ساقی
یہ بدلی مجھ کو رحمت کی گھٹا معلوم ہوتی ہے

ادائے دل رُبائی کی نہ جانے کیا قیامت ہو
ادائے جاں ستاں جب دل رُبا معلوم ہوتی ہے

دُعا کے واسطے اب مرتعش ہاتھ اُٹھتے نہیں اپنے
طبیعت محوِ تسلیم و رضا معلوم ہوتی ہے

۱۹۳۷

جنونِ سعیٔ لاحاصل کہاں ہے
مرے پہلو میں اب وہ دل کہاں ہے
ہر اک نقشِ قدم پر رُکنے والے
خبر بھی ہے تجھے منزل کہاں ہے

معاف اے دردِ عشق اے دردِ فرقت	یہ دل اب درد کے قابل کہاں ہے
ہزاروں منزلیں ہیں اس سے آگے	درِ کعبہ مری منزل کہاں ہے
کسی کی جستجو میں کھو کے دِل کو	ہر اک سے پوچھتا ہوں دل کہاں ہے
سرِ منزل یہ سب سے پوچھتا ہوں	کہ میرے شوق کی منزل کہاں ہے
قضا پر منحصر ہے راحتِ دل	مری کشتی کہاں ساحل کہاں ہے

دُعا کو عرش تک جانے کا سودا
مسافر ہے کہاں منزل کہاں ہے	۱۹۳۷

خموشی نے سُنایا حالِ مجبوری فغاں ہو کر
مری آنکھوں نے دل کی ترجمانی کی فغاں ہو کر
چلے آؤ مرے دل میں مری تسکینِ جاں ہو کر
سرورِ مستقل بن کر نشاطِ جاوداں ہو کر
ابھی تو آرزوئے مضطرب کا عہدِ طفلی ہے
خدا جانے یہ کیا کیا حشر ڈھائے گی جواں ہو کر

ذرا کم ہو چلی ہیں گرمیاں شوقِ محبّت کی
خفا ہو جاؤ پھر اک بار ہم سے بدگماں ہو کر

ہر اک ٹہنی لچک جائے ہر اک غنچہ چٹک جائے
گلستاں میں جو تُو آئے بہارِ گلستاں ہو کر

مری عرضِ تمنّا میں بھی آخر کچھ تو جادُو ہے
نہیں بھی اب نکلتی ہے تمہارے منہ سے ہاں ہو کر

صبا جن کو اُڑا کر لے گئی صحنِ گلستاں سے
وہی تنکے بسیرا دیں گے مجھ کو آشیاں ہو کر

محبّت میں یہی سب سے بڑی نامہربانی ہے
غضب ہے آپ کا ملنا کسی سے مہرباں ہو کر

مری واماندگی میں کچھ تو تھے آثار ہمّت کے
رہا میں کارواں کے ساتھ گردِ کارواں ہو کر

تمیزِ کفر و ایماں مٹ چکی ہے عرش اب دل سے
صدا ناقوس کی کانوں میں آتی ہے اذاں ہو کر

۱۹۳۷

اُن کو یاد آئے تو شاید وہ کہیں یاد مجھے
اتنا مایوس نہ کر اے دلِ ناشاد مجھے

اب تو یہ حال ہے مل بیٹھ کے رو لیتے ہیں
دلِ برباد کو میں اور دلِ برباد مجھے

ہم صفیرو یہ مسرّت کا ترانہ کیسا
ہو تو لینے دو ابھی قید سے آزاد مجھے

ابھی کچھ حسرتِ پروانہ ہے میرے دل میں
بال و پر کاٹ کے چھوڑا ہے مرے صیّاد مجھے

آہ وہ بات کہ جس بات پہ دل دے بیٹھا
یاد کرنے پہ بھی آتی نہیں اب یاد مجھے

نہ نشیمن ہے نہ ہے شاخِ نشیمن باقی
لُطف جب ہے کہ کرے اب کوئی برباد مجھے

میں سُناتا ہوں غمِ دل کا فسانہ دل کو
دل سُناتا ہے مرے عشق کی روداد مجھے

دلِ آگاہ کو غفلت بھی عطا کی ہوتی
اِک مصیبت ہے محبت میں تری یاد مجھے

دُور ہے منزلِ مقصود تو پروا نہیں عرشؔ
لے ہی جائے گی وہاں تک مری فریاد مجھے

١٩٣٧

ہر نفس کو شمار کرتا ہوں
یوں ترا انتظار کرتا ہوں

ایک دھوکا ہے میرا ضبطِ جنوں
انتظارِ بہار کرتا ہوں

حسن پہ گو یقیں نہیں مجھ کو — عشق پر اعتبار کرتا ہوں

زندگی کا تو اعتبار نہیں — تم پہ میں اعتبار کرتا ہوں

دل اگر مائلِ سکوں ہو کبھی — خود اسے بے قرار کرتا ہوں

اک نگاہِ عتاب کی خاطر — التجائیں ہزار کرتا ہوں

دیکھ جائیں وہ اک نظر اے عرش

بس یہی انتظار کرتا ہوں ۱۹۳۶

سمجھا تو یہ سمجھا میں نے جانا تو یہ جانا ہے

ہر ویرانہ اک بستی ہے ہر بستی ویرانہ ہے

رہبر یا تو رہزن نکلے یا ہیں اپنے آپ میں گم

قافلے والے کس سے پوچھیں کس منزل تک جانا ہے

کس کا قرب کہاں کی دوری اپنے آپ سے غافل ہو

راز اگر پانے کا پوچھے کھو جانا ہی پانا ہے

جینا جنگ ہے طوفانوں کی موت ہے میٹھی نیند فقط

جینے سے جب ڈر نہیں تجھ کو موت سے کیا گھبرانا ہے

بیداری کو خواب نہ کہہ تُو خواب کو بھی بیداری جان
کس نے کہا تجھ سے یہ دُنیا اک جھوٹا افسانہ ہے

جلنا ہو یا جل جانا کچھ فرق نہیں ان دونوں میں
پروانہ بھی شمع ہے غافل شمع بھی اک پروانہ ہے

عشق سراسر ایک حقیقت عشق سراسر لافانی
حُسن پہ کیوں اترلتے ہو تم حُسن تو اک افسانہ ہے

میری عرضِ تمنّا پر احباب سے وُہ یہ کہتے ہیں
عرشؔ کی باتیں کیا سنتے ہو عرشؔ تو اک دیوانہ ہے

۱۹۳۶

اُس پری پیکر کو جب بھی یاد کر لیتا ہوں میں
دِل کے ویرانے کو حُسن آباد کر لیتا ہوں میں

خود فراموشی کے عالم میں بھی اتنا ہوش ہے
اُس تغافل آشنا کو یاد کر لیتا ہوں میں

اے ستم پرور مرے اِس حوصلے کی داد دے
سامنے تیرے اگر فریاد کر لیتا ہوں میں

حال کو روتا ہوں مستقبل کو رٹنے کے لئے
جب کبھی گذرے ہوئے دن یاد کر لیتا ہوں میں

آرزوؤں کی اُمیدوں کی تجھی سے ہے بہار
ایک گُل سے سو چمن آباد کر لیتا ہوں میں

دل کی بربادی ہے گو راحت نشاں میرے لئے
پھر تری خاطر اسے آباد کر لیتا ہوں میں

اپنا افسانہ سناتا ہوں کسی کے نام سے
اس طرح دلچسپ یہ رو داد کر لیتا ہوں میں

اِن کی باتیں اِن کی گھاتیں عرشؔ ان کو دیکھ کر
یاد کر لیتا ہوں اکثر یاد کر لیتا ہوں میں

۱۹۳۶

مجھ سے اتنا نہ انحراف کرو	جو خطا ہو گئی معاف کرو
میں خطاؤں کو مان لیتا ہوں	تم محبّت کا اعتراف کرو
یہ کدورت تمہیں نہیں زیبا	دل کو میری طرف سے صاف کرو
فیصلہ تم پہ اب تو چھوڑ دیا	میرے حق میں کرو خلاف کرو

میری ہر بات میں ہے مجبوری — میری ہر بات کو معاف کرو
صاف ہے میرے دل کا آئینہ — مجھ سے تم بات صاف صاف کرو

کوئے جاناں مقامِ فیض ہے عرش
تم اسی کعبے کا طواف کرو

۱۹۳۶

اُمیدوں پر پھرا جاتا ہے پانی — ٹھہر اے دیدۂ تر کی روانی
دیا کیوں اس کو عشقِ جاودانی — عطا کی جس کو تو نے عمرِ فانی
جوانی ہے مرے ساقی جوانی — پلا جامِ شرابِ ارغوانی
تری ہر بات پر میں سر بہ سجدہ — مری اک بات بھی تو نے نہ مانی
وہ سچّا واقعہ ہے عاشقی کا — جسے کہتے ہو تم جھوٹی کہانی
مرا جاتا ہے کیوں تقویٰ پہ زاہد — جوانی تو ہے روحِ زندگانی
کسی انجام کی پروا نہ کرنا — یہ ہے مفہومِ آغازِ جوانی
بہت دشوار اب ضبطِ فغاں ہے — سہارا دے مجھے اے ناتوانی

نہیں اے عرش دنیا بے حقیقت
کہانی ہے مگر سچی کہانی

۱۹۳۶

مشکل یہ کہانی ہے عقدے ہیں یہ افسانے
اسرارِ محبّت کے آخر کوئی کیا جانے

یہ عشقِ گل و بلبل یہ شمع یہ پروانے
سب ہیں مری اُلفت کے بکھرے ہوئے افسانے

ساقی ترے مستانے ہرگز نہیں دیوانے
بہکی ہوئی باتیں ہیں بیتے ہوئے افسانے

موہوم اُمیدوں سے رونق ہے ہر اک دل میں
آباد انھیں سے ہیں اُجڑے ہوئے کاشانے

تدبیر بنائے گی ہر گام یہ میخانہ
ہوتے ہیں تو ہوں خالی تقدیر کے پیمانے

آغاز جو اچھّا ہے انجام بُرا کیوں ہو
ناداں ہے جو کہتا ہے انجام خدا جانے

احساسِ تمنّا سے خالی ہے تصوّر بھی
ارماں بھی ہیں اب دل کے بھولے ہوئے افسانے

اے عرشؔ سناؤں کیا گذری جو محبّت میں
پُر سوز ہیں یہ باتیں پُر غم ہیں یہ افسانے

۱۹۳۶

دُوسرا دَور

۱۹۳۶ — ۱۹۴۵

نظمیں اور رُباعیاں

وادیٔ کشمیر

تُل رہا ہے زُہد اس کے ہر نظارے کے عوض — وادیٔ کشمیر ہے یا حُورِ فطرت بے نقاب
آسماں سے کلّہ ہائے کوہ کی سرگوشیاں — چاندنی راتوں میں جن کو چُومتا ہے ماہتاب
وادیٔ کہسار کی ندّی ہے جُوئے سلسبیل — ہر طرف چشموں کا پانی آبِ کوثر کا جواب
گوش بر آواز جھرنوں کی صدا پر ہر شجر — یک بیک کھلتی ہوئی غنچوں کی چشمِ نیم خواب
سبزہ ہی سبزہ بلند و پست پر چھایا ہوا — جس طرح محوِ نیاز و ناز اک مستِ شباب
اس فضا میں رُوح کھنچ جائے نہ کیوں زہّاد کی — دلکشی جس کی ہو جنّت کی بہاروں کا جواب
وُہ صدائے زیر و بم وہ ندّیوں کے جلترنگ — کوہ کے پُر کیف سنّاٹے میں جھرنے کا رباب
وہ نسیمِ صبح ہر سُو عطر برساتی ہوئی — وہ مہک وہ تازگی وہ عالمِ شعر و شراب
جا بجا گلگشت کی خاطر حسینوں کے ہجوم — سربسر مٹتا ہوا ہر قلب سے فکرِ ثواب
خانۂ مفلس پہ بھی زرپاش ہے مثلِ کریم — وادیٔ کہسار میں حُسنِ غروبِ آفتاب
مارِ سیمیں کی طرح جاتی ہے بل کھاتی ہوئی — کوہ کے دامن میں جوئے کوہ کا یہ اضطراب
دیدۂ اہلِ ہوس سے دُور آ کر اس جگہ — ہو گئی دوشیزۂ فطرت سراسر بے نقاب
کس قدر پُر لطف ہے مفتی امیر احمد کا شعر — "لیجئے دنیا کی ساری نعمتوں کا انتخاب

لیجئے شیراز سے مے پیجیے کشمیر میں"

۱۹۴۴

پُرانا جُوتا

گوشۂ صحن میں اک سمت پُرانا جُوتا
جیسے مرتا ہُوا اک مفلس و بیکس مزدور
نوحہ کرتا ہو کسی حسن پرست آقا کا
اور کہتا ہُوا یہ رو رُو کے بہ حالِ مجبور

شمع جب سرد ہو پروانوں کی حسرت بیکار
موت کے بعد عزیزوں کی محبّت بیکار

یہ وہ جُوتا ہے کہ جب زور پہ تھا اس کا شباب
میرے ہمراہ تھا ہر اک بلند ایواں میں
اس کی آواز سے ڈر جاتے تھے ماتحت مرے
کام کرتے ہوئے خاموشیٔ غم ساماں میں

جوئے گلشن کے دلآویز کنارے کیا کیا
اس نے دیکھے ہیں مرے ساتھ نظارے کیا کیا

راہِ خدمت میں نہ کانٹوں سے کبھی گھبرایا
یہ قدم بوس رہا مثلِ غلامِ بے دام
کوچہ، بازار، طرب گاہ، سنیما، دفتر
صورتِ وقت مرے ساتھ رہا محوِ خرام

یہ مرے ساتھ حسینوں کی عیادت کو گیا
اہلِ عرفاں کے مزاروں کی زیارت کو گیا

ہاں یہ جوتا جسے بھنگی نے اُٹھایا ہوتا ایک ٹھوکر کا بھی تو آج سزاوار نہیں
اس پہ پڑتی نہیں اب کوئی توجّہ کی نظر بچّے فٹ بال بنانے کو بھی تیار نہیں

لاشہ یہ نام خدا درخورِ تربت ہوتا
دیکھنے کو اسے یا دیدۂ عبرت ہوتا

ہے اگر کہنہ نظام ایک پُرانا جوتا نظمِ نَو بھی تو کسی روز پُرانا ہوگا
آج تقدیر سے ہے دوست زمانہ جس کا اس کا دشمن بھی تو اک رُوز زمانا ہوگا

الغرض نقشہ بگڑنے پہ سنورتا ہے یہاں
اک نہ اک جوتا شب و روز اُترتا ہے یہاں ۱۹۴۴

بڑھے چلو

وطن کی آبرو ہو تم بڑھے چلو بڑھے چلو وطن کے چارہ جُو ہو تم بڑھے چلو بڑھے چلو
جواں ہو نیک خو ہو تم بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھو تو سُرخ رو ہو تم بڑھے چلو بڑھے چلو

بڑھے چلو دلاورو — دِلاورو بڑھے چلو

جہاں ستیزہ کار ہے دلاوری کا وقت ہے ۔۔۔ خضر نہیں تو ہو نہ ہو سکندری کا وقت ہے
خدا گری کو چھوڑ دو کہ خود گری کا وقت ہے ۔۔۔ اُٹھو پیامِ شوق دو پیمبری کا وقت ہے

بڑھے چلو دلاورو ۔ دلاورو بڑھے چلو

نشاط و عیش چھوڑ کر رباب و چنگ چھوڑ کر ۔۔۔ شباب اور شباب کی ہر ایک اُمنگ چھوڑ کر
عدوئے آبرو ہو جو وہ عذرِ لنگ چھوڑ کر ۔۔۔ عمل فریب بُزدلی کو بے درنگ چھوڑ کر

بڑھے چلو دلاورو ۔ دلاورو بڑھے چلو

۱۹۴۲

دیہاتی دوشیزہ

کارواں تاریکیوں کا ہو گیا آخر رواں ۔۔۔ جانبِ مشرق سے نکلا آفتابِ زرفشاں
اوس کے قطرے میں موتی کی چمک پیدا ہوئی ۔۔۔ ریت کے ذرّے میں ہیرے کی دمک پیدا ہوئی
نور کی بارش سے پھر ہر نخل نورانی ہُوا ۔۔۔ آتشِ سیّال پھر بہتا ہوا پانی ہُوا
سو گئی پھر منہ چھپا کر نور کے پردے میں رات ۔۔۔ جاگ اُٹھی پھر فضا پھر جگمگائی کائنات
پھر عروسِ صبح کی زُلفیں سنورنے لگ گئیں ۔۔۔ گاؤں پہ بیداریاں پھر رقص کرنے لگ گئیں

پھر ملو کر چھاچھ فارغ عورتیں ہونے لگیں
اپنے بچّوں کو جگا کر اُن کے منہ دھونے لگیں

کھیت میں دہقان دھیمے راگ پھر گانے لگا
سینۂ گیتی کو سوزِ دل سے گرمانے لگا

گو نہیں تھی اس کو مدّھم اور پنچم کی تمیز
گو نہیں تھی اس کو سُر کی تال کی سَم کی تمیز

پھر بھی ہاں اس کا نغمہ اک جادو بھرا اعجاز تھا
گوشہ گوشہ ہر فضا کا گوش بر آواز تھا

صبح کی ٹھنڈی ہوا میں عطر افشاں تھی شمیم
صبح کی ٹھنڈی ہوا تھی باغِ جنّت کی نسیم

تیز جھونکے سے ہوا کے جھومتی تھیں ڈالیاں
شوق سے اک دوسرے کو چومتی تھیں ڈالیاں

نہر کے پُل پر کھڑا میں دیکھتا تھا یہ بہار
میرا دل تھا ایک کیفِ بیخودی سے ہم کنار

دیکھتا کیا ہوں کہ اک دوشیزۂ مجبورِ حجاب
غیرتِ حورانِ جنّت پیکرِ حُسن و شباب

آ رہی تھی نہر کی جانب ادا سے ناز سے
ہر قدم اُٹھتا تھا اُس کا اک نئے انداز سے

حُسنِ سادہ میں ادا بھی بانکپن کا رنگ بھی
کچھ پڑھے سیکھے ہوئے شرم و حیا کے ڈھنگ بھی

لب پہ سادہ سی ہنسی اور تن پہ سادہ سا لباس
بے حجابی سے بڑھی آتی تھی بے خوف و ہراس

سر بسر نا آشنا شوخی کے ہر مفہوم سے
کچھ اگر واقف تو واقف شوخئ معصوم سے

حُسن میں الھڑ طبیعت میں ذرا ناداں سی
سادہ لوحی کا مُرقّع بے سمجھ انجان سی

حُسن کی معصومیت میں کافری انداز بھی
باخبر بھی بے خبر مستِ شرابِ ناز بھی

شمع وہ جس پہ شبستانوں کی رونق ہو نثار
کیف وہ جس کے لئے سو میکدے ہوں بے قرار

ناز وہ جس سے ربابِ حسن کی تکمیل ہو
شعر وہ جس سے کتابِ حسن کی تکمیل ہو

ایک بازو کے سہارے سے گھڑا تھامے ہوئے
دوسرے سے اوڑھنی کا اک سرا تھامے ہوئے

نہر پہ پہنچی گھڑا بھر کر ذرا سستا گئی
تھک گئی یا سوچ کر کچھ خود بخود شرما گئی

مجھ کو دیکھا تو جبیں پر ایک بل سا آ گیا
اُف رے شانِ تمکنت میں خوف سے تھرا گیا

اس پہ حیرت یہ کہ لب اس کے تبسم ریز تھے
کیا کہوں انداز سب اُس کے قیامت خیز تھے

تھام کر آخر گھڑا وہ اک ادا سے پھر گئی
ایک بجلی تھی کہ میرے دل پہ آکر گر گئی

مجھ کو یہ حسرت کہ دے سکتا سہارا ہی اسے
کب مگر احسان لینا تھا گوارا ہی اسے

گنگنائی کچھ مگر سننے کا کس کو ہوش تھا
میں زباں رکھتا تھا لیکن سر بسر خاموش تھا

جا رہی تھی وہ گھڑا تھامیں اسیرِ اضطراب
دل ہی دل میں کر رہا تھا اس طرح اس سے خطاب

اے نگینِ خاتمِ نسوانیت صد آفریں
اے امینِ جوہرِ انسانیت صد آفریں

آفریں اے گوہرِ یکتائے عصمت آفریں
آفریں اے پیکرِ حسن و محبت آفریں

حسن تیرا گو رہینِ جلوہ سامانی نہیں
گو ترے رخسار پہ پوڈر کی تابانی نہیں

تجھ میں شہری عورتوں کی گو نہیں آرائشیں
گو نہیں تجھ کو میسر ظاہری زیبائشیں

پرتوِ حسنِ حقیقت پھر بھی تیرا حسن ہے
مایۂ حسنِ شرافت پھر بھی تیرا حسن ہے

مایۂ عفت ہے تو نسوانیت کی شان ہے
تجھ پہ ہر تقدیس ہر پاکیزگی قربان ہے

جھک نہیں سکتا کسی در پر ترا حسنِ غیور تو سکھا سکتی ہے دنیا کی نگاہوں کو شعور
سادگی سے تیری پُر رونق یہ دلکش وادیاں مائلِ حسنِ تصنّع شہر کی آبادیاں
تو ہوس سے دُور ہے حرص و ہوا سے تو نفور ہے ترے زیرِ قدم سو تاجداروں کا غرور
ہوش سے بڑھ کر تری ہر لغزشِ مستانہ ہے جو تجھے پاگل سمجھتا ہے وہ خود دیوانہ ہے
بے ادب کم علم کہہ کر یاد کرتا ہے جہاں بے شعوری پہ بھی تیری صاد کرتا ہے جہاں
تُو ارسطو کو سکھا سکتی ہے آئینِ حیات دیکھ سکتی ہے نگاہوں سے تو نبضِ کائنات
سامنے تیرے عروجِ تختِ شاہی ہیچ ہے ہیچ ہے تیری نظر میں کج کلاہی ہیچ ہے

جا! مگر مڑ کر مرے اس دل کی بربادی کو دیکھ
میری مجبوری کو دیکھ اور اپنی آزادی کو دیکھ

۱۹۴۰

وداعِ غم

دردکو عیش کی تمہید بنانا ہے مجھے

اے غمِ دوست یہ اب اذنِ فراموشی کیوں
دلِ پُر شوق! یہ اب جذبۂ غم کوشی کیوں

یاس کو روکشِ اُمید بنانا ہے مجھے

دلِ غم کیش کو پیغامِ مسرّت دے کر
حسرتِ مردہ کو جینے کی بشارت دے کر
ہجر کو راحتِ نظارہ کی دولت دے کر

آنکھ کو مستِ مئے دید بنانا ہے مجھے

محو ہونا ہے مجھے حسن کے نظّاروں میں

رقصِ ناہید سے انجم کی دلآویزی سے

نغمۂ مطربِ رنگیں کی طرب خیزی سے

دل کو لے جانا ہے عشرت کے طرب زاروں میں

میری ہر ایک تمنّا پہ بہار آئے گی

ہر دعا میری اجابت بکنار آئے گی

بہرِ دل نعمتِ تسکین و قرار آئے گی

حسن خود ہوگا محبّت کے پرستاروں میں

رات چھیڑے گی مرے واسطے تاروں کا رباب

نغمے آئیں گے طبیعت کو بہلنے کے لئے

جلوے آئیں گے مرے پاس مچلنے کے لئے

رخِ سیمیں لئے قدموں پہ گرے گا مہتاب

عالمِ کشف و کرامات میں جینا ہے مجھے

ساغرِ جم میں جو مے تھی اسے پینا ہے مجھے

دامنِ جہل کے ہر چاک کو سینا ہے مجھے

یوں الٹنا ہے مجھے چہرۂ فطرت سے نقاب

زہدِ نا فہم کا اے جذبۂ دل کام نہیں
زُہد کو رندی و مستی سے لڑانے دے مجھے
کیف بن کر دلِ احباب پہ چھانے دے مجھے
گو تہی دست ہوں لیکن میں تہی جام نہیں
جلوۂ دوست سے مایوس نظر کیا معنی
کش مکش ہائے محبّت سے حذر کیا معنی
طعنِ اغیار سے دل محوِ خطر کیا معنی
عِشق کِس کام کا ہے عشق جو بد نام نہیں
آرزوئے دلِ پُر کیف پہ آئی ہے بہار
رسمِ کیخسرو و جم تازہ کروں گا میں ضرور
بادۂ عیش سے جام اپنا بھروں گا میں ضرور
عالمِ قدس پہ چھاؤں گا کہ چھائی ہے بہار
مانعِ عیش نہیں خوفِ خدا اے ساقی
بادہ و جام میں ہے رازِ بقا اے ساقی
درِ رحمت ہے مرے واسطے وا اے ساقی
مژدہ یہ گلشنِ فردوس سے لائی ہے بہار

لوگ کہتے ہیں بدلنے کو ہے دُنیا کا نظام
ساقیا اور کہ اب اور کا وقت آیا ہے
دَور چلنے دے کہ اب دَور کا وقت آیا ہے
یہ سفر وہ ہے کہ جس میں کوئی منزل نہ مقام
کوئی تہذیب کو کہتا ہے عذابِ عالم
کوئی تخریب کو کہتا ہے ثوابِ عالم
درس دیتی ہے مگر مجھ کو کتابِ عالم
جنّتِ گوش ہے بس قلقلِ مینا کا پیام
مستیٔ قلقلِ مینا میں ہے رازِ ہستی
دَورِ ساغر ہے کہ ہے گردشِ عالم کا جواب
صحنِ مے خانہ میں ہیں جام کہ ہیں چنگ و رباب
نغمۂ قلقلِ مینا ہے کہ سازِ ہستی
لب پہ اے جوشِ جنوں نعرۂ ہُو آنے دے
ساقیا بزم میں مینا و سبُو آنے دے
بادۂ روح فزا بہرِ وضو آنے دے
آج کہنی ہے ادا مجھ کو نمازِ ہستی

۱۹۴۰

بسنت

اے بسنت اے ہر خزاں دیدہ کے دل کی آرزو
اے بسنت اے خاروخس کے حق میں پیغامِ نمو

غازۂ روئے گلستاں اے بہارِ زندگی
اے دلِ افسردہ کے حق میں قرارِ زندگی

یاد ہیں وُہ دن نفاق اس دیس میں آیا نہ تھا
دل پئے آزارِ ہمسایہ کا ہمسایا نہ تھا

آہ وہ دن یہ ہوائے تُند جب چلتی نہ تھی
جب شرابِ عیش غم کے جام میں ڈھلتی نہ تھی

آہ وُہ دن ہندو و مُسلم میں جب باہم تھا پیار
جب تھی اخلاص و محبّت کی فضائے سازگار

آہ نغمے عید کے جب مل کے ہم گاتے رہے
رام لیلا دیکھنے مل جُل کے ہم جاتے رہے

شورِ ناقوس و اذاں میں جب نہ تھا کچھ امتیاز
جب نہ فتنہ تھا یہاں کوئی نہ کوئی فتنہ ساز

جب ہمارے دم سے تھی آنِ وطن شانِ وطن
پھاگ مل کر کھیلتے تھے جب جوانانِ وطن

ہاں وہ دن اُلفت کے دن فرحت کے دلشادی کے دن
وُہ مسرت کی فضائیں اور وہ آزادی کے دن

یاد ہیں وہ دن تو لا وہ عہدِ ماضی کی بہار
جو دلوں سے دُور کر ڈالے کدُورت کا غبار

تیرے گل بوٹے ہمارے کام آ سکتے نہیں
بات جو بگڑی ہے اُس کو یہ بنا سکتے نہیں

کیا کریں ہم اس بہارِ ننگ بو کو کیا کریں
بادۂ گلرنگ کو گُل کے سبُو کو کیا کریں

ہم کو دینا ہے تو صلح و آشتی کا جام دے
ہندو و مسلم کو پھر اخلاص کا پیغام دے

اے بسنت اک اپنے پھولوں سے بنا تعمیرِ نَو
خوابِ دیرینِ وطن کی اک سُنا تعبیرِ نو

تیرے دامن میں ہیں جیسے گُل قطار اندر قطار
اور ہر اک پھول رکھتا ہے جُدا اپنی بہار

سب کے سب ہوتے ہیں لیکن غازۂ روئے چمن
ہم بھی اس انداز سے ہوں زینتِ باغِ وطن

پھر منائیں ہم تجھے پھر گیت گائیں پریت کے
پھر یہاں نقشے جمائیں عاشقوں کی ریت کے

۱۹۳۹

بسنت

کدورتوں کا ہے زور اتنا کہ زندگی ہے وبال سب کی
جُدا جُدا رنگ ڈھنگ سب کے جدا جُدا چال ڈھال سب کی
نہ پریم اُن میں نہ پیار اُن میں نہ ایک کا دوسرا سہائی
وطن سے پت جھڑ نے منہ نہ موڑا بسنت آئی تو خاک آئی

تمام گھر بار لٹ چکا ہے نہ مال باقی نہ دھن ہے باقی
جدھر سے دیکھو اُدھر سے کورے نہ علم باقی نہ فن ہے باقی
گئی نہ افسوس اب بھی ان کی یہ روز کی بے سبب لڑائی
وطن سے پت جھڑ نے مُنہ نہ موڑا بسنت آئی تو خاک آئی

خمیر ہے تفرقے سے ان کا نہ ایک روٹی نہ ایک پانی
نہ اک زباں ہے نہ ایک بھاشا نہ ایک بولی نہ ایک بانی
رقابتوں سے بھرے ہوئے دل زباں سے اِک دوسرے کے بھائی
وطن سے پت جھڑ نے مُنہ نہ موڑا بسنت آئی تو خاک آئی

خدا خدا رام رام کہہ کر فریب دیتے ہیں یہ جہاں کو
نشاں جو باقی ہے زندگی کا مٹا رہے ہیں اِسی نشاں کو
مزاج ہیں خود پسند سب کے طبیعتوں میں ہے خودنمائی
وطن سے پت جھڑ نے مُنہ نہ موڑا بسنت آئی تو خاک آئی

۱۹۳۹

فسادِ کانپور

کانپور کی رزم آرائی کا حال باعثِ صد ننگ ہے اے ہم وطن

باڑ ہی جب کھیت کو کھانے لگے
کیوں نہ پھر اُجڑے پھلا پھولا چمن

اتحادِ باہمی کی لاش پر
مل کے روئیں آج شیخ و برہمن

اس جنوں کا بھی تو آخر کچھ علاج
چاک ہے اخلاص کا ہر پیرہن

منفعلہ خوئی عہدِ نو کی ہو گئی
باعثِ ننگِ روایاتِ کہن

اے جنوں ساماں خرد برباد قوم
سوچ کچھ تو سوچ انجامِ وطن

۱۹۳۹

کانپور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے فسادات

مانگتا ہوں تجھ سے میں جس کا جواب
غور سے اے مہرباں وہ بات سُن

ذوقِ آزادی کی شہنشائی کے ساتھ
کانپور نے چھیڑ دی ماتم کی دُھن

حشر کیا ہو گا غلام آباد کا

موسمِ گل کی بھی آمد دیکھ لی
گھر ہیں ویرانے چمن پامال ہیں

رنگ ہولی کے بھی آنے کا ہے خوب
خُون سے دیوار و در سب لال ہیں

حشر کیا ہو گا غلام آباد کا

جس طرف دیکھو اُدھر اُڑتی ہے خاک — وہ بھی دِن تھے سب اُڑاتے تھے گلال
غیر کے لاکھوں گلے ہم نے کیے — اب تو اپنوں سے ہے یہ اپنا سوال
حشر کیا ہوگا غلام آباد کا
ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے حال پر — جُھک رہی ہے شرم کے مارے جبیں
سوچنے کو یوں تو سوچا ہے بہت — یہ مگر ہم نے کبھی سوچا نہیں
حشر کیا ہوگا غلام آباد کا

۱۹۳۹

ہولی اور ہندوستان

اک طرف راحت کا اور فرحت کا کال — اِک طرف ہولی میں اُڑتا ہے گُلال
اک طرف یاروں کی عشرت کوشیاں — اک طرف ہم اور حالِ پُر ملال
اک طرف دَورِ شرابِ آتشیں — اک طرف تلچھٹ کا ملنا بھی محال
دیکھتے ہیں تجھ کو جب اُٹھتی ہے ہُوک — آہ اے ہندوستاں اے خستہ حال
رحم کے قابل یہ بربادی تری — دید کے قابل ہے یہ تیرا زوال
کس قدر خونریز ہے کتنا قبیح — تیری مسجد اور مندر کا سوال

اُف ترے بیٹوں کی رزم آرائیاں
آہ اُن کے باہمی جنگ و جدال

اپنے فرزندوں کے یہ اطوار دیکھ
دیکھ یہ لعنت کے قابل چال ڈھال

کس قدر ذلّت کے دلدادہ ہیں یہ
بے کمالی میں ہیں کتنے باکمال

سینۂ تہذیب پر ہے پنجہ زن
دین کے جھگڑوں میں ان کا اشتغال

دامنِ اخلاق پر دھبّہ ہے ایک
ان کی وحشت خیزیوں کا اِتّصال

۱۹۳۹

ماتمِ اقبال

آنکھ میری اشک افشاں ہے غمِ اقبال میں
تو بھی رو اے خاکِ مشرق ماتمِ اقبال میں

بزمِ عالم میں کیا تھا جس نے اونچا نامِ شرق
سرنگوں ہو جاؤ اُس کے غم میں اے اقوامِ شرق

جس کے فرحت زا ترانوں میں تھا نامِ پاکِ ہند
رو اسے جی بھر کے رو جی بھر کے رو اے خاکِ ہند

رومؔ و تبریزؔ آشنا، وہ برہمن زادہ کہاں
پیرِ میخانہ کہاں وہ جام وہ بادہ کہاں
عرشؔ اپنا فرض اس غم میں نہ ہرگز بھول تو
اس کی تربت پر چڑھا دے آنسوؤں کے پھول تو

۱۹۳۷

ریڈیو پر گانے والی سے

تری نواؤں سے معمور ہر فضائے بسیط
ہے ختم تجھ پہ ہنر، بے نیازِ عیب ہے تو

ترا سرودِ دلافزا ہے اک جہاں پہ محیط
نوائے قدس ہے یا اک صدائے غیب ہے تو

تصوّرات میں تصویر کھنچ رہی ہے تری
الم سرشت دلوں کے لئے سرور ہے تو

شبیہ آنکھ میں ہر اک کے بس گئی ہے تری
گناہگار کے حق میں مئے طہور ہے تو

یہ ساز و دل کی ہم آہنگیاں معاذ اللہ
کسی خیال میں نغمہ کسی میں ساز ہے تو

ترے کمال کی نیرنگیاں معاذ اللہ
کسی میں ساحرۂ کیفیت نواز ہے تو

نہاں نظر سے ترا جلوۂ حسیں کیوں ہے
تری نواؤں سے ہے حسن آشکار ترا

ہر ایک آنکھ سے چھپتی ہے شرمگیں کیوں ہے
میں کیوں نہ حور و پری میں کروں شمار ترا

مرے لئے ہی فقط نغمہ جانگداز ہے کیوں
رہینِ سوز ترا لحنِ دل نواز ہے کیوں
یہ تیرِ عشق ہے یا سحرِ دل نوازی ہے
نیاز مند سے اتنی جو بے نیازی ہے
گھٹا ملال کی دل پر برس رہی ہے تو کیا
نگاہ دید کی خاطر ترس رہی ہے تو کیا
مرے خیال کی دنیا میں ہے مقام ترا
پیامِ دید ہے میرے لئے کلام ترا

۱۹۳۹

بنسی

اک لطف سے بھرپور ہیں گوکل کے نظارے
اک کیف سے معمور ہیں جمنا کے کنارے
برج بھوم کے امبر پہ چمکتے ہوئے تارے
کرتے ہیں کسی بات پہ آپس میں اشارے
شاید انھیں یاد آتی ہے گھنشام کی بنسی
برسانے کے محبوبِ دلآرام کی بنسی

وہ بانس کی پوری جو تھی نغموں کا خزانہ　　لَے جس کی انوکھی تھی نرالا تھا ترانہ
بُھولا ہے نہ بھولے گا کبھی جس کا فسانہ　　ہے جس کے لئے گوش بر آواز زمانہ

اے کاش وہ گیت اپنا سُناتی ہوئی آئے
نغمات کی مے سب کو پلاتی ہوئی آئے

پھر دشتِ وطن پہ ہمیں جنّت کا گماں ہو　　راحت کا یہاں گھر ہو مسرّت کا مکاں ہو
غم کا ہو کہیں نام نہ کلفت کا نشاں ہو　　پھر تان پہ ہو تان مسرّت کا سماں ہو

ساقی بھی کرے رقص تو مے خوار بھی جُھومیں
مستی کا یہ عالم ہو کہ اشجار بھی جُھومیں

زر دار کے دینار تو نادار کے پیسے　　ہر شے کو زمانے میں ہے نسبت کسی شے سے
رندوں کو صُراحی سے صراحی کو ہے مے سے　　گھنشام کو بنسی سے تو بنسی کو ہے لَے سے

وابستہ ہے اس لَے سے اگر کوئی تو میں ہوں
ہے اس کا جو پابندِ اثر کوئی تو میں ہُوں

١٩٣٩

مُغنّیہ

تُو ناز کی پُتلی ہے تُو انداز سراپا
تُو سحر ہمہ تن ہے تُو اعجاز سراپا
تُو سر بسر اک نغمہ تُو اِک ساز سراپا

اے سازِ خوش آہنگ مجھے سوز بنا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

افسوں تری باتوں میں تبسّم میں ہے جادو
نغموں میں ہے اک سحر ترنم میں ہے جادو
خاموش نگاہوں کے تکلم میں ہے جادو

جادو سے مری حسرتِ مُردہ کو جلا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

اے شوخ نگاہی سے مچلتی ہوئی پُتلی
اے نشّے میں گر گر کے سنبھلتی ہوئی پتلی
اے حُسن کے آغوش میں پلتی ہوئی پتلی
نغمات کی مے سے مجھے بے ہوش بنا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سنا دے
سپنوں کا وہی گیت

یہ جوشِ جوانی کا یہ اندازِ حیا کا
یہ مست نگاہی یہ ترا حُسن بلا کا
کاری ہے بہت وار تری تیغِ ادا کا
اس تیغ کے صدقے تو اسے مجھ پہ چلا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سنا دے
سپنوں کا وہی گیت

آنکھیں بھی تری دید کا حاصل بھی ہے تیرا
منزل بھی تری راہئ منزل بھی ہے تیرا
دنیا بھی تری میں بھی ترا دل بھی ہے تیرا

جس نیند کی حسرت ہے مجھے اس میں سلا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

بوٹا سا یہ قد اور یہ الھڑ سی جوانی
یہ حُسن کا عالم کہ ہر اک آئینہ پانی
جذبات کے دریا میں قیامت کی روانی

میرے دل و جاں بھی اسی دریا میں بہا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

اندھے کے اکھاڑے کے لئے ناز کے ساماں
تو غیرتِ صد حور ہے تو آفت بداماں
جنّت کی بہاریں ہیں ترے نام پہ قرباں
مرتا ہوں میں تیرے لئے جینے کی دعا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سنا دے
سپنوں کا وہی گیت

پھر برق تبسّم کی گرا ہوش رُبا بن
دل میں جو اُتر جائے وہ دلدوز نوا بن
پھر سوز سے معمور پپیہے کی صدا بن
پھر دل میں مرے پریم کی اک آگ لگا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

اُڑتا ہُوا بادل تری زُلفوں کی سیاہی
سمٹا ہُوا طوفاں تری محبوب نگاہی
چلتا ہُوا جادُو تری میخانہ پناہی

دیوانے کو اب اور بھی دیوانہ بنا دے
اک بار وہی گیت وہی گیت سُنا دے
سپنوں کا وہی گیت

۱۹۳۹

ہمارا وطن

پھلوں سے لدے جس کے اشجار ہیں — مہکتے ہُوئے جس کے گلزار ہیں
نرالی ہے جس کے گلوں کی پھبن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

گلاب اور جوہی کی جس میں بہار — سمن ہے جہاں ہر چمن کا سنگار
کھِلے ہیں جہاں نرگس و نسترن — ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ہے پورب سے پچھم نرالا جہاں ہے اُتّر کا دولھا ہمالہ جہاں
کُماری جہاں ہے عروسِ دکن ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

کہیں گومتی بیاس گوداوری کہیں گھاگھرا، نربدا، تاپتی
کہیں جس میں بہتے ہیں گنگ و جمن ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ہر اک پھل، ہر اک پھول، ہرا تر جہاں ہواؤں میں جس کی ہے عنبر نہاں
فضائیں ہیں جس کی چمن در چمن ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

پپیہا الاپے جہاں پی کہاں سنائیں عنادل ترانے جہاں
ہے آموں پہ کوئل جہاں نغمہ زن ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

اناج اور میووں کی کثرت جہاں ہے پانی میں بھی اک حلاوت جہاں
جو ہم کو بناتا ہے شیریں سخن ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

کیا جس کی مٹی نے پیدا ہمیں   نہ کیوں فخر سے اُس کا ہم نام لیں
کہیں مل کے سب شیخ اور برہمن   ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

۱۹۳۸

کالج کے لڑکے

ہند کے افلاس کی تصویر دل میں کھینچ کر
غور سے دیکھو ذرا کالج کے لڑکوں کا لباس
آہ اُن کی اِس نئی سج دھج پہ قرباں جائیے
مائیں جن کی بیلتی ہوں بیٹھ کر گھر میں کپاس
باپ کو حفظِ کفایت سے نہیں چھکڑا نصیب
ان کو موٹر چاہیئے یا ریل کی سیکنڈ کلاس
نیم جاں جسموں کی یہ تصویرِ عبرت دیکھیئے
قیمتی پوشاک تن پر اور چہرے ہیں اُداس

اِن کے جیسٹر کو اُٹھانے کے لئے لازم قلی

باپ کرتا ہے مشقّت صورتِ گاؤِ خراس

اِن کے قول و فعل میں مطلق نہیں وابستگی

ان کے سب نعرے فریب ان کے ارادے بے اساس

لرزہ براندام ان کے جذبہ ہائے خود پرست

ان کا عزمِ حیلہ جُو اور موت کا خوف و ہراس

کب انھیں منظور ہے بہرِ وطن غم جھیلنا

عیش و عشرت کے چمن کی ہر ہوا ان کو ہے راس

ننگِ ملک و قوم ہے ہر نوجوانِ حال مست

قلبِ نا ہنجار میں اب ہے کہاں غیرت کا پاس

ایک دُنیا ہے تری اس بے بسی کی نوحہ خواں

رو انھیں جی بھر کے رو اے مادرِ ہندوستاں

۱۹۳۸

حقیقتِ تلخ

صنم کدہ ہو کلیسا ہو دَیر ہو کہ کنشت
نہ خوب رسم یہ ان کے نہ ان کے بس میں ہے زشت

یہ لافِ برہمن و شیخ زادگی کیسی
کوئی غرور نسب سے نہیں ہے نیک سرشت

خیالِ حُور و قصور و مئے طہور نہ کر
اگر تو غور سے دیکھے تو زندگی ہے بہشت

ہیں ایک دل ہی میں تسکین و اضطراب نہاں
اسی کا نام ہے دوزخ اسی کا نام بہشت

یہ مسجد اور یہ مندر خدا کے گھر توبہ!
اور ان میں آ کے تُو کرتا ہے آرزوئے بہشت

ترے فریب و ریا کے ہیں مقبرے گویا
یہ رکھ دئے ہیں جو چُن چُن کے تونے سنگ و خشت

مجھے خطر ہے کہیں مات کھا نہ جائے تُو
بساطِ دہر میں ہر ہر قدم پہ تجھکو ہے کشت

۱۹۳۸

دیوالی

(فسادات دہلی و ملتان سے متاثر ہو کر)

تو صفِ ماتم بچھاتا ہے وطن میں آئے دن
آہ اے ملتان اے پنجاب کے سینے کے داغ

ہیں فساد و فتنہ و شر کے عناصر زور پر
امن کا تیری فضاؤں میں نہیں ملتا سراغ

قتل و غارت کی زمیں اے دہلیٔ خونیں کفن
گُل کئے ہیں تُو نے کتنے خانوادوں کے چراغ

تو نے صدیوں سے پلایا ہے جو دے دے کر فریب
اب بھی اس زہراب سے لبریز ہے تیرا ایاغ

آہ وہ بھی گھر ہیں جن میں اک دیا جلتا نہیں
دشمنوں کے گھر میں جلتے ہیں مگر گھی کے چراغ

کِس خوشی پہ ہو چراغاں سے وطن میں روشنی
کب ہمیں حاصل ہُوا درد و مُصیبت سے فراغ

ہو گئے ہیں سب کے سب اس دَور میں نذرِ خزاں
وہ بہارِ پُر فضا، وہ حُسنِ گُل، وہ صحنِ باغ

اے وطن اُف تیرے بیٹوں کی یہ رزم آرائیاں
آہ مذہب نے بگاڑے اُن کے دل اُن کے دماغ

دیپ مالا کے منانے کا بھی کیا انداز ہے
آگ خود گھر میں لگاتے ہیں یہاں گھر کے چراغ

۱۹۳۸

فرقہ پرست رہنما سے

بدنُما دھبّا ہے تُو اِک آستینِ قوم پر
تُو ہے داغِ ذلّت دسپی جبینِ قوم پر
تو مُخلِ ہوتا ہے سب کی فطرتِ آزاد میں
بیٹھ کر دیں تجھے ہم اِس غلام آباد میں

حرّیت سے عار اور مذہب کا ہر دم غم تجھے
دین کی خاطر رہا دنیا کا بھی ماتم تجھے
غور سے دیکھیں تو ہے یہ بھی ریاکاری کا جال
انتہائے خود فروشی ہے یہ غدّاری کا جال
ہندو و مسلم کے دل میں آگ بھڑکاتا ہے تو
کس شقاوت سے انہیں اس جال میں لاتا ہے تو
کس قدر مرغوب ہیں تجھ کو یہ رزم آرائیاں
الاماں اے قتل و غارت کے پیمبر الاماں
خون کتنے بے گناہوں کا بہا دیتا ہے تو
کتنے مظلوموں کے دل کی بد دعا لیتا ہے تو
خاک کر دیں تو نے حبِّ قوم کی بیداریاں
مشتعل جذبات ہیں یا آگ کی چنگاریاں
مسجد و مندر کے حق میں خوش بیانی کا کمال
گائے اور باجے کے حق میں تر زبانی کا کمال
بے نہایت جوش پھیلانا غمِ ناموس میں
قتل و غارت کے اشارے حرمتِ ناقوس میں

واسطے بہرِ اذاں دینا بلالی شان سے
جنگ کی ترغیب میں اُٹھنا جلالی شان سے

اِن فریبوں میں کیا ہے تو نے دُنیا کو اسیر
اے یتیموں اور مظلوموں کے جھُوٹے دستگیر

طوقِ محکومی کی لعنت ہے تو تیرے دم سے ہے
ہندیوں کی پست حالت ہے تو تیرے دم سے ہے

مدّعی بہبودئ ملّت کا ہے تو الحذر
چارہ گر مذہب کی ہر آفت کا ہے تو الحذر

یاد ہیں تجھ کو اگر کچھ مسئلے تو جنگ کے
تو نے قصّے پاک کر ڈالے ہیں نام و ننگ کے

تجھ کو ننگِ آدمیت کہہ کے کرتا ہوں خطاب
اے کہ تو ہے قوم کے حق میں جہنّم کا عذاب

تُو ہی ملکِ ہند کی بربادیوں کی جان ہے
قوم کے خونیں فسانے کا تو ہی عنوان ہے

۱۹۳۷

جوشِ شوق

بسنت میں دلِ پُر داغ پہ نکھار نہیں
بہار میں بھی چمن میں مرے بہار نہیں
سکوں نہیں کسی پہلو مجھے قرار نہیں
وہ بے کلی ہے کہ جینے کا اعتبار نہیں
اِدھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

قسم تجھے مری اُلفت کے شوق و مستی کی
قسم تجھے مری وحشت کی چیرہ دستی کی
قسم تجھے ترے اندازِ خود پرستی کی
قسم تجھے تری زاہد فریب ہستی کی
اِدھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

وفا کے پاک گناہوں کے بھولنے والے
دیارِ شوق کی راہوں کے بھولنے والے
وفا سرشت نگاہوں کے بھولنے والے
قتیلِ عشق کی آہوں کے بھولنے والے

ادھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

مرے خیال کی دُنیا کے تاجدار حسیں
مری اُمید کی بستی کے شہریار حسیں
مرے فراق کے عالم کے غمگسار حسیں
مری نگاہِ تصوّر کے سحر کار حسیں

ادھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

رہے گی دل میں سُلگتی یہ آگ سی کب تک
یہ میرا شوقِ تقاضا یہ دل لگی کب تک
رہینِ یاس رہے گی یہ زندگی کب تک
یہ میرے حال سے غفلت یہ بے رُخی کب تک

ادھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

قسم تجھے قدِ رعنا کی فتنہ کاری کی
بس اجتناب نہ کر حد ہے بے قراری کی
نظر چُرا کے بہت میری دلفگاری کی
بہت حیا نے ترے رُخ کی پردہ داری کی

اِدھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

رہے گی گلشنِ تقدیر میں خزاں کب تک
نہ ہوگا چرخِ ستم گار مہرباں کب تک
کھلی رہے گی یہ فرقت کی داستاں کب تک
رہے گا عرش جنوں مائلِ فغاں کب تک

اِدھر بھی دیکھ کہ اب تابِ انتظار نہیں

۱۹۳۷

ساون

سوز سے معمور پی پی کی صدائیں آگئیں
کیف سے بھرپور ساون کی گھٹائیں آگئیں

ابر برسا سبزۂ خوابیدہ لہرانے لگا
اُس کی دُھن میں دلِ بے آرزو گانے لگا

کونپلیں پھُوٹیں گل و غنچہ نے لیں انگڑائیاں
زینتِ فطرت ہوئیں فطرت کی حُسن آرائیاں

نیم کے سائے میں کچھ الّھڑ کنواری لڑکیاں
بھولی بھالی سر بسر معصوم پیاری لڑکیاں

ایک جھُولا اور اس جھُولے میں سب کے دل اسیر
ایک ہالے میں ہوں جیسے سینکڑوں ماہِ منیر

اک طرف کو اوڑھنی ہر ایک نے رکھّی ہوئی
دن کو صحنِ گلستاں میں، چاندنی چھٹکی ہوئی

گلشنِ شاداب اور اس پر بہاروں کا ہجوم
دل ربا، دل کش، دل افزا ماہ پاروں کا ہجوم

جھُولتی ہے ایک اور گاتی ہیں سب مل کر ملہار
گوش بر آواز ہیں بُوٹے قطار اندر قطار

گوپیاں یہ گیت گاتی ہیں سلونے شام کے
ان کو کیا معلوم تیور گردشِ ایّام کے

۱۹۳۷

غلط بخشیٔ فطرت

جوہرِ خاص ہے ناقدریٔ عالم کا شکار
جوہرِ خاص کا حصّہ ہے غمِ بے پایاں
مردِ نا اہل کو ہر وقت میسّر راحت
مردِ جوہر کے لئے روز کے رنج و حرماں
مخلصوں کے لئے ہر لمحہ مصیبت کی گھڑی
سفلہ طبعوں کو مقدّر نے کیا ہے شاداں
گنجِ قاروں کے وہ مالک کہ جو فطرت سے بخیل
جو غنی دل کے ہیں افلاس سے ہر دم نالاں
عاجزی کا تو جہاں میں نہیں گاہک کوئی
اہلِ پندار کی چلتی ہے زمانے میں دکاں
کور ذوقوں کے لئے مسند و منصب کا عروج
صاحبِ ذوق ہے تقدیر کے ہاتھوں نالاں

اُف کہ مزدور کی محنت ہو صلے سے محروم

اہلِ زر کے لئے ہوں عیش کے لاکھوں ساماں

خانہ ویراں ہیں زمانے میں جو ہیں پاک سرشت

بوالہوس کے لئے موجود ہیں قصر و ایواں

اہلِ زر ظلم کریں بھی تو پھلیں اور پھولیں

مردِ نادار کی تاثیر سے خالی ہے فغاں

جو توجہ کے بھی لائق نہیں ممتاز ہے وہ

سنگِ خارا ہے زر و سیم سے قیمت میں گراں

مل رہا ہے جو یہاں چرب زبانوں کو کمال

کام اس دَور میں آتی نہیں تاثیرِ بیاں

شاید اک روز اُلٹ جائے بساطِ عالم

ہم کو ہر بات سے ہوتا ہے قیامت کا گماں

یہ غلط بخشیٔ فطرت جو نہیں تو کیا ہے

"اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر مے بینم"

۱۹۳۷

ٹاکی

عجب عجب کہ زمانے نے رنگ کیا بدلے
ہراک زبان پہ ہے ارض اور سما بدلے
کمال پر ہے جو تدبیرِ حضرتِ انساں
ہواؤں پر بھی یہ طائرِ صفت ہُوا جولاں
ہزار کوس کی بیٹھے سنو کمال ہے یہ
یہ ریڈیو ہے کہ الہام کی مثال ہے یہ
ہیں نورِ برق سے پُر نُور باغ و راغ یہاں
بغیر تیل کے جلنے لگے چراغ یہاں
مِلا کے رکھ ہی دیئے اس نے آگ اور پانی
ہے کن ارادوں پہ کیا جانے "عقلِ انسانی"
خدائی کیسے کرے گی یہ سوچ تھی دِل میں
کہ بولنے لگیں خود آ کے سامنے فلمیں
وہ شعبدوں کا کرامت سے داؤ پیچ ہُوا
جو سامری کا تھا جادُو وُہ آج ہیچ ہُوا

۱۹۳۶

قسم

قسم اُس حُسن کی جس میں ہے شوخی بھی لطافت بھی
قسم اُس حُسن کی جس میں ہے تلخی بھی حلاوت بھی
قسم اُس حُسن کی سارا زمانہ جس کا شیدا ہے
قسم اُس حُسن کی رازِ جہاں جس سے ہویدا ہے
قسم اُس حُسن کی پہلی صفت جس کی ہے رعنائی
قسم اُس حُسن کی دربان ہے جس کے در کی زیبائی
قسم اُس حُسن کی جس کے لئے بیتاب رہتا ہوں
قسم اُس حُسن کی جس کے ہزاروں ناز سہتا ہوں
قسم اُس حُسن کی جس سے مروّت دُور رہتی ہے
قسم اُس حُسن کی جس سے وفا کافور رہتی ہے
قسم اُس حُسن کی جس سے ہے کیفِ سرمدی حاصل
قسم اُس حُسن کی جس سے ہے جنّت کی خوشی حاصل

قسم اُس آنکھ کی کیفیت جس سے چھلکتی ہیں
قسم اُس آنکھ کی سرمستیاں جس میں جھلکتی ہیں
قسم اُس رُخ کی بھولے پن سے جو مسحور کرتا ہے
قسم اُس رُخ کی دل کی کلفتیں جو دُور کرتا ہے
قسم جذبات سے بریز اس ہلکے تبسّم کی
قسم اس ہچکچاہٹ سے بھرے ذوقِ تکلّم کی
قسم ان پُر غضب بے مہر دُزدیدہ نگاہوں کی
قسم اس شکوۂ برباد کی ان سرد آہوں کی
قسم اس کی محبّت کا سمجھنا جس کو مشکل ہے
قسم اس کی جو اپنے چاہنے والے سے غافل ہے
قسم اس کی وفاؤں میں جسے گھُلنا نہیں آتا
قسم اس گُل کی کانٹوں میں جسے تُلنا نہیں آتا
قسم اس رات کی عاشق شبِ غم جس کو کہتے ہیں
قسم اس نازِ بے جا کی جسے وہ روز سہتے ہیں
قسم اس شوق کی جو دل میں رہ رہ کے مچلتا ہے
قسم اس دردِ دل کی جو نئے پہلو بدلتا ہے

قسم اُس پریم کی جس کی لگی اب جا نہیں سکتی
قسم اس بات کی دل سے جو لب تک آ نہیں سکتی
قسم ان کیف زا پچھلی ملاقاتوں کی راتوں کی
قسم ان رس بھری باتوں پرانی وارداتوں کی
قسم نالوں کی جو دل سے نکلنے کو ترستے ہیں
قسم اشکوں کی جو غم میں گھٹا بن کر برستے ہیں
قسم اس ہجر کی جس میں فغاں کا شور رہتا ہے
قسم اس ہجر کی جس میں الم کا زور رہتا ہے
قسم اس عشق کی تقدیس جس کے در کی درباں ہے
قسم اس عشق کی پاکیزگی خود جس پہ قرباں ہے
قسم اس عیش کی ہستی عدم ہے جس کی دُنیا میں
قسم اس عیش کی تمہید غم ہے جس کی عُقبیٰ میں
قسم اس وصل کی جو رُوح کی تسکین کا ساماں ہے
قسم اس وصل کی جس کے لئے عالم پریشاں ہے
قسم اس رُوح کی جس سے ہے نامِ عشق تابندہ
قسم اس رُوح کی جس سے ہے نامِ آرزو زندہ

قسم اُس حُسن کی جس میں جمالِ خود نمائی ہے
قسم اُس حسن کی جس میں جلالِ کبریائی ہے
غمِ جاناں کو اب دِل سے بھُلانا مجھ کو مشکل ہے
بنا کر نقشِ اُلفت کا مٹانا مجھ کو مُشکل ہے

۱۹۳۶

قسم (۲)

قسم مہتاب کی، مہتاب کے سیمیں نظاروں کی
قسم صحنِ گلستاں کے طرب زا سبزہ زاروں کی
قسم اُن آبشاروں کی کہ جو موتی اُگلتے ہیں
قسم اُن شاخساروں کی جہاں جلوے مچلتے ہیں
قسم سیمیں عذاروں کی گلستاں کی بہاروں کی
قسم اشجار کی اشجار کے رنگیں نظاروں کی
قسم کلیوں کی کلیوں کے سرور افزا چٹکنے کی
قسم پھولوں کی پھُولوں سے گلستاں کے مہکنے کی

قسم حسنِ جہاں آرا کی سحر آگیں اداؤں کی
قسم صحنِ گلستاں کی طرب افزا فضاؤں کی

قسم عہدِ جوانی کی جو روحِ زندگانی ہے
قسم اس عشق کی جو حاصلِ دُنیائے فانی ہے
قسم اس بے قراری کی قرارِ دل جسے کہئے
قسم اس داغِ اُلفت کی بہارِ دل جسے کہئے
قسم اس درد کی جو رات بھر سونے نہیں دیتا
قسم اس ضبط کی جی بھر کے جو رونے نہیں دیتا
قسم اس نقشِ پا کی جس کے حصّے میں ہے پامالی
قسم اس خاک کی قسمت میں جس کے ہے زبوں حالی
قسم اس خواب کی پھر سے نظر جو آ نہیں سکتا
قسم اس بات کی جس کی قسم دل کھا نہیں سکتا
قسم اس کی جو میخانے میں رہ کر تشنہ کام آئے
قسم اس خط کی بعدِ مرگ جو عاشق کے نام آئے

قسم اس آگ کی جو چین سے جینے نہیں دیتی
قسم اس زخم کی دنیا جسے سینے نہیں دیتی
قسم مزدور کے افلاس کی عسرت کی ذلت کی
قسم محنت کی بنیادیں ہیں جس پر جاہ و ثروت کی
قسم کشتی کی جو منت کش ساحل نہیں ہوتی
قسم اس راہ کی جس میں کہیں منزل نہیں ہوتی
قسم بیمار کی جس کا بڑی مشکل سے دم نکلے
قسم حسرت کی جو اُلفت میں نکلے بھی تو کم نکلے
قسم تدبیر کی جو شاکیٔ تقدیر رہتی ہے
قسم تقریر کی جو ضبط کی تصویر رہتی ہے
قسم اُس دیس کی جس میں کوئی اپنا نہیں ملتا
قسم اُس دل کی جس کا غنچۂ مقصد نہیں ملتا
قسم اُس ناخدا کی ساتھ جو گرداب میں چھوڑے
قسم اُس آس کی جو نامرادی ہی کے دل توڑے
قسم اُس رند کی جس تک نہ جائے جام محفل میں
قسم حسرت کی جو حسرت کی صورت ہی رہے دل میں

قسم ہے اُس شناور کی جیسے دریا نگل جائے
قسم اُس آشیاں کی جو بہار آتے ہی جل جائے
قسم اُس آنکھ کی جس کے کبھی آنسو نہیں تھمتے
قسم اُس صبر کی جس کے قدم دل میں نہیں جمتے
قسم اُس سوز کی جس میں ہزار دل ساز پنہاں ہیں
قسم اُس راز کی جس میں نیاز و ناز پنہاں ہیں
قسم شمع جمالِ حُسن کی سوز آفرینی کی
قسم صوفی منش درویش کی عزلت نشینی کی
قسم تصویر کی جس پر مٹے بیمار فرقت کا
قسم تصویر کی جس سے گھٹے آزار فرقت کا
قسم اس کی نہیں مدّمقابل جس کا دُنیا میں
قسم اُس کی جو لاثانی ہے اپنے حُسنِ یکتا میں
میں تیری یاد سے دم بھر بھی غافل ہو نہیں سکتا
ترا جو ہو چکا اب وُہ مرا دل ہو نہیں سکتا

۱۹۳۶

ہندوستان میرا

دیسوں میں سب سے اچھا ہندوستان میرا
روئے زمیں پہ جنّت جنّت نشان میرا
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

وُہ پیارا پیارا منظر وہ موہنی فضائیں
وہ اُونچے اُونچے پربت وہ دلفزا گھٹائیں
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

تینوں طرف سمندر چوتھی طرف ہمالا
ہے پاسباں اس کا اس کے بنانے والا
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

غنچوں کا وہ چٹکنا پھُولوں کا وہ مہکنا
پنچھی پنچھیروؤں کا وہ صبحدم مہکنا
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

دھیمے سُروں میں گنگا یہ گیت گا رہی ہے
جمنا بھی اپنے مُنہ میں یہ گنگنا رہی ہے
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

گوکل کا اک گوالا بنسی بجا رہا ہے
بنسی کی لَے میں وُہ بھی یہ گیت گا رہا ہے
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

دُنیا کے سارے میوے اس گلستاں میں ہیں
سب نعمتیں میسّر ہندوستان میں ہیں
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

میرا نشاں یہی ہے میرا جہاں یہی ہے
جنّت مری یہی ہے میرا مکاں یہی ہے
ہندوستان میرا۔ ہندوستان میرا

۱۹۳۶

رُباعیات

کیوں اتنا پریشاں ہے نشیمن کے لئے
اللہ سے دُعا مانگ تو گلشن کے لئے
اِک دانے کی خاطر یہ تری گھبراہٹ
بیتاب اُدھر برق ہے خرمن کے لئے

طوفاں کے تلاطم میں کنارا کیا ہے
گرداب میں تنکے کا سہارا کیا ہے
سوچا بھی ہے اے زیست پہ مرنے والے
مٹتی ہوئی موجوں کا اشارا کیا ہے

عشرت میں بھی دل شاد نہیں ہیں ہم لوگ
بیگانۂ فریاد نہیں ہیں ہم لوگ
ہے ساتھ گناہوں کے خیالِ رحمت
عصیاں میں بھی آزاد نہیں ہیں ہم لوگ

مٹتے ہیں زمانے پہ زمانے والے
بے لوث نہیں جان سے جانے والے
بھرتے ہی رہے رنگ ہوس کا اس میں
تصویر تمنا کی بنانے والے

ہو راہزنی لاکھ شعارِ رہبر
قائم ہے یہاں پھر بھی وقارِ رہبر
اے سادگیٔ اہلِ وطن کیا کہنا
منزل ہوئی جاتی ہے نثارِ رہبر

ہر شخص ہے محتاجِ کمالِ رہبر
منزل سے زیادہ ہے خیالِ رہبر
اور اُس کا ہے یہ حال کہ خود راہ میں گُم
کتنا ہے الم ناک مآلِ رہبر

ہر دل میں ہے اک ہول سراسر تسلیم
اب قول نہیں قول سراسر تسلیم
شیطان پہ لاحول سراسر باطل
انسان پہ لاحول سراسر تسلیم

انفاس کو سمجھا ہے مدارِ ہستی
اور بے خبرِ رسمِ دیارِ ہستی
تو موت کو دیتا ہے خزاں سے نسبت
ہے موت ہی دراصل بہارِ ہستی

دنیا ہے یہ گو رنگ بدلنے کے لئے
گرنے کے لئے گر کے سنبھلنے کے لئے
رکنے کے لئے مگر نہیں ہیں یہ قدم
چلنے کے لئے ملے ہیں چلنے کے لئے

ادراک کا یہ وہم ٹلے تو اچھا
یہ علم کا بوٹا نہ پھلے تو اچھا
بجھ جائے گا اے دوست چراغِ عرفاں
یہ صرصرِ دانش نہ چلے تو اچھا

ہستی مری شرمندۂ ہستی کیوں ہو
رفعت مری ہم پایۂ پستی کیوں ہو
سو ہوش سے بڑھ کے ہے مری بیہوشی
مرہونِ خرد عالمِ مستی کیوں ہو

گو علم سے باہر کوئی امکان نہیں
بے علمِ یقیں علم میں بھی جان نہیں
یہ بھول بھلیاں مری آگاہی کی
جس گھر میں ہوں خود اس کی بھی پہچان نہیں

اشکوں میں ندامت کو سمو لیتا ہوں
پندار کے ہر داغ کو دھو لیتا ہوں
اس سے تو حسیں تر تھی شبیہِ وحشت
تصویرِ خرد دیکھ کے رو لیتا ہوں

اے جرعہ کشِ بادۂ ہستی ہشیار
جاں دادۂ پیمانۂ مستی ہشیار
آتی ہے دعا عرش سے ناکام تری
تو اور یہ خمیازۂ پستی ہشیار

پندارِ ہوس، نعرہ کشِ جنگِ عمل
شورِ قدمِ سست ہم آہنگِ عمل
کاوش میں جھلک ذوقِ تن آسانی کی
سر پھوڑ نہ دے تیرا کہیں سنگِ عمل

سرمایۂ خونابہ فشانی دل ہے
آئینۂ غم ہائے نہانی دل ہے
اوّل نہیں جس کا نہیں آخر جس کا
اے عرش وہ دل سوز کہانی دل ہے

جذباتِ غم و رنج کا دفترِ دل ہے
آلام کا آفات کا مصدر دل ہے
خود ڈوب کے اوروں کو بھی جو لے ڈوبے
وہ بحرِ محبّت کا شناور دل ہے

ہر منظرِ ہستی کا نشاں ہے دل میں
ہر جلوۂ عالم کا مکاں ہے دل میں
اس نقطۂ دو حرفی پہ نہ بھولو اے عرش
ہر رازِ زمانے کا نہاں ہے دل میں

دن رات کھلی رہتی ہیں راہیں دل کی
تکتی ہیں کسے روزنگاہیں دل کی
یہ کس کا تصور ہے یہ کس کا ہے خیال
روکے سے جو رُکتی نہیں آہیں دل کی

دیکھی کبھی خالی نہ پیالی دِل کی
مستی ہے مگر پھر بھی خیالی دل کی
دیکھے کوئی، سوچے کوئی، سمجھے کوئی
ہر بات ہے دُنیا سے نرالی دل کی

گنجینۂ اسرارِ معانی دل ہے
دُنیائے محبّت کی کہانی دل ہے
یہ ہے تو شگفتہ ہیں سبھی گل بُوٹے
رنگینئ گلزارِ جوانی دل ہے

اللہ رے یہ دن یہ زمانہ دِل کا
مرغوب ہے ہر دل کو ترانہ دل کا
اے عرش اسے کہتے ہیں محبّت کا کمال
سب شوق سے سنتے ہیں فسانہ دل کا

اب صبر ہے دل میں نہ شکیبائی ہے
لا بادۂ گلگوں کہ بہار آئی ہے
بس دیر نہ کر وقت ہے رحمت کا یہی
اُٹھ دیکھ کہ گلشن پہ گھٹا چھائی ہے

پرہیز گناہوں سے نہ کر اے ناداں — پینے سے نہ ڈر اس میں نہیں کچھ نقصاں
رحمت کے نزول کا ہے مفہوم یہی — بخشش کا ہے مستحق فقط تر داماں

اک آگ سی دل میں ہے بجھا اے ساقی — پینے کی ہے جو چیز وہ لا اے ساقی
کیا فکر جو ملتا نہیں ساغر کوئی — چلّو ہی سے دو گھونٹ پلا اے ساقی

یہ ہستی و نیستی کا جھگڑا کیا ہے — یہ مرگ و حیات کا تماشا کیا ہے
ہم خود کو سمجھنے سے ہیں قاصر اے عرش — کیونکر یہ بتائیں کہ یہ دنیا کیا ہے

دل میں ترے اے شیخ یہ کیا بیٹھا ہے — کیوں عظمتِ رندی کو بھلا بیٹھا ہے
جو نقد ملے اس کو بتاتا ہے حرام — کیوں جھوٹ پہ تو ادھار کھا بیٹھا ہے

بے کیف ہے بے کیف شرابِ ہستی — اک سازِ شکستہ ہے ربابِ ہستی
ہر باب کا عنوان فنا ہے اس میں — ناقابلِ درس ہے کتابِ ہستی

کیوں عرش پہ پہنچا ہے دماغِ ہستی
مرجھائے گا دو روز میں باغِ ہستی
کیوں اتنی کدورت ہے غریبوں سے تجھے
کیوں دامنِ ہستی پہ ہے داغِ ہستی

دو روز کی مہماں ہے بہارِ ہستی
بے اصل ہے رُوئے تابدارِ ہستی
ہیں موجِ سراب سے زیادہ بے بُود
تُو اور یہ سب نقش و نگارِ ہستی

ہوتا ہے اگر تو ہو غلامِ ہستی
سُنتا ہے اگر تو سُن پیامِ ہستی
اک بات مگر کام کی یہ بھی سُن لے
خالی ہے مئے عیش سے جامِ ہستی

زاہد جسے کہتا ہے ثوابِ ہستی
رِند اُس کو سمجھتے ہیں عذابِ ہستی
جینا ہے تو کچھ لطف اُٹھا جینے کا
پی شوق سے پی جامِ شرابِ ہستی

کہتے ہیں کہ رہتا ہے تو شہ رگ سے قریب
اِس پہ بھی تجھے پا نہ سکوں اُف رے نصیب
یا تو ہی نرالا ہے زمانے بھر میں
یا عقل ہے میری ہی زمانے سے عجیب

حرکت ترے دم سے ہے ہر آب و گِل میں
رونق ترے جلوے سے ہے ہر منزل میں
شاعر کا تخیّل بھی ہے اک فیض ترا
تو رُوحِ فضا میں ہے کتابِ دل میں

ایسا کوئی ناخُدا را مِل جائے
ایسا کوئی غیب سے سہارا مِل جائے
منجدھار سے بچ نکلے مری کشتیٔ دل
دریائے محبّت کا کنارا مِل جائے

تو سوزِ حقیقی ہے میں پروانہ ہُوں
تو بادۂ گُلرنگ میں پیمانہ ہُوں
تو رُوح ہے میں جسم ہوں تو اصل ہے میں نقل
جس میں ہے بیاں تیرا وہ افسانہ ہُوں

پہلا دور

۱۹۲۶ — ۱۹۳۵

غزلیں

بیانِ عشق میں رُک رُک کے چلتی ہے زباں میری
سناؤں کیا بہت صبر آزما ہے داستاں میری

کسی کے سامنے دیکھے کوئی مجبوریاں میری
کہ اپنی داستاں کہنے سے عاجز ہے زباں میری

قفس سے اب رہائی بھی ملی مجھ کو تو لاحاصل
چمن میں پھونک دی بجلی نے شاخِ آشیاں میری

زمیں کے ذرّے ذرّے پہ رقم ہے میرا افسانہ
فلک کے ہر ستارے پر لکھی ہے داستاں میری

مرے مرنے میں بھی مُضمر ہیں لاکھوں راز جینے کے
بہت دلچسپ ہے گو مختصر ہے داستاں میری

ملا ہے عرشؔ یہ ذوقِ سخن میراث میں مجھ کو
نہ ہو کیوں رشک کے قابل بیاں میرا زباں میری

۱۹۳۵

کیوں نہ ہو دادِ طلب ہمّتِ مردانۂ دِل
مائلِ حسنِ جہاں سوز ہے پروانۂ دِل

ایک عبرت کا مرقّع ہے الم خانۂ دِل
حسرت و یاس کا افسانہ ہے افسانۂ دِل

جس کو رہتی ہے کسی اور کے جلوے کی تلاش
اُس نے دیکھا ہی نہیں جلوۂ جانانۂ دِل

اب میں سمجھا کہ محبّت میں اثر ہے کتنا
لوگ سنتے ہیں بڑے شوق سے افسانۂ دِل

قابلِ داد ہے یہ شوقِ طلب اے ساقی
لے کے آیا ہوں میں ٹوٹا ہوا پیمانۂ دِل

اِک زمانے کو جلا دیتا ہے جل کر اے عرش
شعلۂ برقِ جہاں سوز ہے پروانۂ دِل

۱۹۳۵

محبّت میں جانا تو یہ ہم نے جانا
نہیں بے ٹھکانوں کا کوئی ٹھکانا

کسی ڈھب تو دنیا میں دن کاٹنے ہیں
قفس ہی کو سمجھیں گے اب آشیانا

کوئی لاکھ اُلفت سے پرہیز رکھے
جوانی سکھا دے گی دل کا لگانا

جوانی، محبّت، وفا، نااُمیدی
یہ ہے مختصر سا ہمارا فسانا

نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
وفا کی کہانی، الم کا فسانا

کئے دل نے ہر اک جگہ تجھ کو سجدے
جبیں ڈھونڈتی ہی رہی آستانا

یہ رُت اور شملے کی اُودی گھٹائیں
ہے پینے کا اے عرشؔ اچھا بہانا

۱۹۳۵

محبّت وہ مرض ہے جس کا چارا ہو نہیں سکتا
جگر کا ہو کہ دل کا زخم اچھا ہو نہیں سکتا

وہ نالہ کوئی نالہ ہے جو کم ہو موجِ طوفاں سے
وہ آنسو کوئی آنسو ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

تماشا ہے کہ ہم اس کو مسیحا دم سمجھتے ہیں
ہمارے درد کا جس سے مداوا ہو نہیں سکتا

مجھے فریاد پہ مائل نہ کر اے جوشِ ناکامی
زمانے بھر میں دل کا راز رسوا ہو نہیں سکتا

عجب کیا ہے جو خاموشی ہی شرحِ آرزو کر دے
مرے لب سے تو اظہارِ تمنّا ہو نہیں سکتا

مبارک ہو تجھی کو یہ خیالستان اے واعظ
تری دنیا میں رندِ دل کا گزارا ہو نہیں سکتا

تماشا ہو گیا ہے تیرے جلوؤں کا تماشائی
کوئی اس شان سے محوِ تماشا ہو نہیں سکتا
بدل سکتے ہو تم بگڑی ہوئی قسمت زمانے کی
تمھاری اک نگاہِ ناز سے کیا ہو نہیں سکتا

دل کو فریبِ حُسن پہ دھوکا نہ ہو سکا
مستِ الست مائلِ دُنیا نہ ہو سکا
کیا ہو کسی کے وعدۂ فردا پہ اعتبار
خود زندگی پہ ہم کو بھروسا نہ ہو سکا
تُو مل گیا تو دولتِ کونین مل گئی
ہو کر ترا میں اور کسی کا نہ ہو سکا
ہو بھی تو ہو تلافیٔ مافات کس طرح
محفل میں اُن سے ایک بھی شکوا نہ ہو سکا

نالہ خلافِ عشق تو نغمہ خلافِ دل
میں ہم نوا جہاں میں کسی کا نہ ہو سکا

ابرِ بہار، موسمِ گل، بزمِ نائے و نوش
اس پر بھی شیخ مائلِ صہبا نہ ہو سکا

پردہ اُٹھا تو پڑ گئے تحیّر کے چھا گئے
میرے نصیب میں ترا جلوہ نہ ہو سکا

اے عرش زخمِ دل ہی سے ہے کائناتِ دل
اچھا ہُوا کہ زخم یہ اچھا نہ ہو سکا

۱۹۳۵

مائلِ ضبط بھی آمادۂ فریاد بھی ہے
دل گرفتارِ محبّت بھی ہے آزاد بھی ہے

داستانِ دلِ مایوس نہ پُوچھ اے ہمدم
یہ وہ بستی ہے جو آباد بھی برباد بھی ہے

اے مرے ضبط کو کامل نہ سمجھنے والے
قابلِ داد مری کوششِ فریاد بھی ہے

اُڑ کے جاؤں بھی تو کیا اور نہ جاؤں بھی تو کیا
منتظر برق بھی ہے تاک میں صیّاد بھی ہے

کیا لکھوں کیا نہ لکھوں سُرخیٔ افسانۂ دِل
غم بھی ہے درد بھی حسرت بھی ہے فریاد بھی ہے

دلِ دیوانہ کی تو مستیٔ ہُشیار نہ پُوچھ
یہ گرفتارِ قفس طائرِ آزاد بھی ہے

میری تسکین تو کر بھُول کے اِتنا تو بتا
یاد رکھنے کا جو وعدہ تھا تجھے یاد بھی ہے

اک روش دل کی ہوا اے عرشؔ تو کچھ بات بھی ہو
کیا مصیبت ہے کہ یہ شاد بھی ناشاد بھی ہے

۱۹۳۵

رنج سے دل کی رہائی عمر بھر ہوتی نہیں
یہ کہانی مرتے دم تک مختصر ہوتی نہیں

ہو گئے محفوظ ہم عیشِ فنا انجام سے
یہ بھی راحت ہے کہ راحت سے بسر ہوتی نہیں

جلوہ گر رہتے ہیں وہ اکثر ہمارے سامنے
بے خودی میں دل کو اتنی بھی خبر ہوتی نہیں

لوگ اس کو سن چکے سن سن کے اکتا بھی گئے
داستانِ عشق لیکن مختصر ہوتی نہیں

وہ کرم اس وقت کرتے ہیں ہمارے حال پر
جب ہمارے حال کی ہم کو خبر ہوتی نہیں

کھل گیا بابِ اثر اے عرشؔ آخر کھل گیا
دل سے نکلے جو دعا وہ بے اثر ہوتی نہیں

۱۹۳۴

یاس میں نالوں کا شورِ ہاو ہُو جاتا رہا
آرزو کے ساتھ جوشِ آرزو جاتا رہا

مِل گیا آخر نشانِ منزلِ مقصد مگر
اب یہ رونا ہے کہ ذوقِ جستجو جاتا رہا

دل کے داغوں پر بہار آئی کچھ اس انداز سے
غنچۂ اُمیّد کا جوشِ نمو جاتا رہا

چشمِ میگوں کے تصوّر نے پلائی اس قدر
اشتیاقِ بادہ و جام و سبو جاتا رہا

کر چکا طے وہ حدودِ عالمِ ادراک کو
تیرے دیوانے کے دل سے خوفِ ہُو جاتا رہا

بے خودی ہے یہ کہ ساقی کے تغافل کا اثر
محفلِ رنداں سے شورِ والشّربو جاتا رہا

کیا لکھوں اے عرش اِن کی تلخ باتوں کا اثر
مختصر یہ ہے کہ ذوقِ گفتگو جاتا رہا

۱۹۳۴

اِس زور پر ہماری اب ناتوانیاں ہیں
اک بوجھ اپنے دِل پر فریاد خوانیاں ہیں

میں خوگرِ جفا ہوں لطف و کرم نہ کرنا
یہ مہربانیاں تو نامہربانیاں ہیں

جو نام کر گئے ہیں مٹ کر رہِ وفا میں
باقی جہاں میں اب تک اُن کی نشانیاں ہیں

یہ فیض مل رہا ہے ہر مہرباں سے مجھ کو
نامہربانیاں ہی نامہربانیاں ہیں

دل سے ہے جوان جن کا دل سے جوان ہیں جو
پیری میں بھی میسرؔ ان کو جوانیاں ہیں

بہلا نہ ہم کو واعظ ذکرِ بہشت سے تُو
یہ من گھڑت فسانے جھوٹی کہانیاں ہیں

۱۹۳۲

نہ فرات و دجلہ پہ ناز کر نہ فریبِ گنگ و جمن میں آ
یہ جہان سب ہے ترا وطن تو کدھر ہے اپنے وطن میں آ

تو ہے رنگِ نرگس و نسترن ہے تجھی سے رونقِ انجمن
ترے منتظر ہیں گل و سمن تو بہار بن کے چمن میں آ

تجھے لاکھ لوگ حسیں کہیں تجھے لاکھ دُرِّ ثمیں کہیں
تری قدر ہو گی فقط یہیں تو حریمِ دل کے عدن میں آ

جو خیالِ خُلد میں ہو مگن مے و انگبیں میں ہو جس کا من
جو وطن میں رہ کے ہو بے وطن اُسے کیا کہوں کہ وطن میں آ

یہ بہارِ باغ یہ محفلیں تری خلوتوں پہ نثار ہوں
تجھے کام غنچہ و گل سے کیا تو چمن کو چھوڑ کے بن میں آ

رہ و رسمِ عشق پہ رکھ نظر ہو جہانِ نو کا پیامبر
نہ گزشتہ عہد کو یاد کر نہ فریبِ چرخِ کہن میں آ

یہ کھلا نہ ہم پہ کہ تو کہاں مئے شعر پی کے نکل گیا
تجھے یاد کرتے ہیں عرش سب کبھی پھر بھی بزمِ سخن میں آ

۱۹۳۳ء

کیا چارہ کریں کیا صبر کریں جب چین ہمیں دِن رات نہیں
یہ اپنے بس کا روگ نہیں یہ اپنے بس کی بات نہیں

جو اُس نے کیا اچھّا ہی کیا جو ہم پہ ہُوا اچھّا ہی ہُوا
اب گریۂ غم کچھ چیز نہیں اب نالۂ غم کچھ بات نہیں

ہم صبر و رضا کے بندے ہیں جو تم نے کیا سب جھیل لیا
اب دل میں بھی افسوس نہیں اب لب پہ بھی ہیہات نہیں

جب اُلفت کا دم بھر بیٹھے جب چال ہی اُلٹی چل بیٹھے
نادان ہو جو یہ کہتے ہو اس چال میں بازی مات نہیں

کچھ رنج نہیں کچھ فکر نہیں دنیا سے الگ ہو بیٹھے ہیں
دل چین سے ہے آرام سے ہے آلام نہیں آفات نہیں

تم لطف کو جور بتاتے ہو تم ناحق شور مچاتے ہو
تم جھوٹی بات بناتے ہو اے عرشؔ یہ اچھی بات نہیں

۱۹۳۳

جو ہو پسند وہ لیل و نہار پیدا کر
تو اپنے رنگ کا خود روزگار پیدا کر

زمانہ تجھ کو سمجھ لے کہ تو ہے صاحبِ طرز
کچھ اِس طرح کا انوکھا شعار پیدا کر

رہینِ موسمِ گل ہو، کبھی نہ گلشن میں
خزاں کے رنگ میں رنگِ بہار پیدا کر

دِکھا بہارِ چمن کی خزاں کے پردے میں
قفس میں رہ کے دلِ داغدار پیدا کر

شکستِ دل سے ہو پیدا صدائے عزمِ صمیم
جو کیف سے ہو فزوں وہ خمار پیدا کر

زمانہ تیری محبّت کا معتقد ہو جائے
نگاہِ شوق میں وہ اعتبار پیدا کر

ہلا دے عرش کو تُو اپنے دل کے نالوں سے
وہ جوشِ گریۂ بے اختیار پیدا کر

١٩٣٢

بُتوں کو بھی خدا کے نور کا جلوا سمجھتے ہیں
پرستارانِ اُلفت دَیر کو کعبا سمجھتے ہیں

الم ہے، یاس ہے، غم ہے پشیمانیٔ اُلفت ہے
انھیں دو چار کو ہم حاصلِ دُنیا سمجھتے ہیں

جنھیں ذوقِ عمل رکھتا ہے محوِ جستجو ہر دم
وہ راہِ شوق کی دشواریوں کو کیا سمجھتے ہیں

بہت دیوانگانِ عشق کہتے ہیں انا مجنوں
مگر کتنے ہیں جو رمزِ انا لیلےٰ سمجھتے ہیں

یہ کیسی چارہ سازی ہے یہ کیسی بے نیازی ہے
مریضِ جاں بلب کو وہ ابھی اچّھا سمجھتے ہیں

ستم ہوں باعثِ ترکِ وفا یہ ہو نہیں سکتا
انھیں ایسا سمجھنے دو اگر ایسا سمجھتے ہیں

تمہارے تیر کو جو دل میں رکھ لیتے ہیں خوش ہو کر
جفائے آسماں کو وہ بلاکش کیا سمجھتے ہیں

جو عقبیٰ کے لئے اے عرشؔ محوِ ترکِ دنیا ہو
اُسے اہلِ بصیرت بندۂ دُنیا سمجھتے ہیں

۱۹۳۲

تو اگر دِل میں ایک بار آئے
عُمر بھر کے لئے قرار آئے

آشیانہ ہی گلستاں میں نہیں
اب خزاں آئے یا بہار آئے

وُہ نہ آئیں تو اے دمِ آخر
لب پہ نام اُن کا بار بار آئے

نہ حرم میں ہیں وہ نہ دَیر میں ہیں
ہم تو دونوں جگہ پکار آئے

اس کو تیرا پیام بر سمجھوں
موت اگر وقتِ انتظار آئے

یاس کہتی ہے کچھ تمنّا کچھ
کس کی باتوں کا اعتبار آئے

موت نے آسرا دیا بھی تو کب
جب مصیبت کے دن گزار آئے

یہ تو کچھ تلخ تھی مرے ساقی
اب جو آئے وہ خوش گوار آئے

غنچۂ آرزو کھلا نہ کبھی
تو نہ آئے تو کیوں بہار آئے

عرش وہ بے قراریاں نہ رہیں
دل کو اب کس طرح قرار آئے

۱۹۳۲

اُمید و بیم کے عالم میں دل اتنا پریشاں ہے
کبھی جینے کی حسرت ہے کبھی مرنے کا ارماں ہے

عروجِ زندگی پر کس لئے اتنا غرور اے دل
نہ ہے تاجِ سرِ قیصر نہ اورنگِ سلیماں ہے

مذمت دردِ اُلفت کی نہ کر اے ہم نشیں اتنی
یہی وہ چیز ہے جس سے بنائے بزمِ امکاں ہے

خطِ تقدیر میں ردّ و بدل ممکن نہیں ہرگز
یہاں تدبیر عاجز، فلسفہ گم عقل حیراں ہے

جفا کے واسطے میری ہی جانِ ناتواں چُن لی
یہ اُن کی خاص بخشش ہے یہ اُن کا خاص احساں ہے

خدا کا نام لے کر عرشی پی جا اور گُم ہو جا
قدح نوشوں کے مشرب میں اسی کا نام ایماں ہے

۱۹۳۲

میں تو ناکامِ انتظار نہیں
دل کو ہی تجھ پہ اعتبار نہیں

دل وہ کیا ہے جو بے قرار نہیں
وہ جگر کیا ہے جو فگار نہیں

اک نیا رنگ ہے زمانے پر
میرے ہی باغ میں بہار نہیں

زندگی مستعار ہے بے شک
جذبۂ عشق مستعار نہیں

اُن کی باتوں پہ اعتبار فضول
اُن کی باتوں کا اعتبار نہیں

آپ اور اک جہان پر قدرت
مجھ کو دِل پر بھی اختیار نہیں

دل پہ کیا خاک اعتبار آئے
زندگی کا ہی اعتبار نہیں
وہ تسلّی بھی دے گئے اے عرشؔ
اب بھی دل کو مرے قرار نہیں

۱۹۳۱

دلِ نیم جاں کو پیامِ بقا دے
مجھے مژدۂ زندگانی سُنا دے
دِل اس شمعِ ہستی کو خورشید سمجھا
کہ ہلکی سی اک سانس جس کو بجھا دے
ابھی بدگماں ہیں وہ اے شوقِ صادق
یہی ایک پردہ ہے اُس کو اُٹھا دے
سمجھتا ہوں میں جھ کو اپنی حقیقت
حقیقت کو تو بھی حقیقت بنا دے

مرے دل کے ارماں سوئے ہوئے ہیں
کبھی خواب میں آکر اُن کو جگا دے
دُعا تجھ سے ملنے کی میں کر رہا ہوں
یہ مقبول ہو مجھ کو اتنی دُعا دے
بنا اپنا مسجود اِک آستاں کو
نہ ہر در پہ اے عرش جا کر صدا دے

۱۹۳۱

جس میں ہو دوزخ کا ڈر کیا لُطف اس جینے میں ہے
توبہ کرنے میں کہاں وُہ جو مزا پینے میں ہے
اے نگاہِ شوق یہ کیسا فریبِ جستجو
عکس اس آئینہ رُو کا دل کے آئینے میں ہے
خشک باتوں میں کہاں اے شیخ کیفِ زندگی
وُہ تو پی کر ہی ملے گا جو مزا پینے میں ہے

بجھ سکے گی تجھ سے کیا دل کی لگی اے چشمِ تر
جس سے جل جائے زمانہ آگ وُہ سینے میں ہے

میں تری تحقیر کر سکتا نہیں اے ضبطِ شوق
میرے سینے میں رہے گا راز جو سینے میں ہے

نخلِ ایمن تک نہیں محدود جلوا طور کا
چیر کر دیکھو تو ہر اک سنگ کے سینے میں ہے

عرش پہ دیکھا جو تو نے اے نگاہِ دُوربیں
آ دکھاؤں میں وہی جلوا مرے سینے میں ہے

۱۹۳۱

یاد جس وقت مجھے وہ ستم ایجاد آیا
لب پہ رہ رہ کے مرے شکوۂ بیداد آیا

حضرتِ شیخ کے لب پہ ہے وہی حُور کی بات
یاد اس کو نہ کبھی کوئی پری زاد آیا

توبہ توبہ یہ بلاخیز جوانی توبہ
دیکھ کر اس بتِ کافر کو خدا یاد آیا

بستی جاتی ہے پھر اُمید کی دنیا دل میں
کوئی بھولا ہوا وعدہ اُنہیں پھر یاد آیا

اس قدر پاس رہا ضبطِ محبّت کا مجھے
اُن کا شکوہ نہ زباں پر دمِ فریاد آیا

جس کی پُر درد نواؤں کی ملے عرش سے داد
میرؔ کے بعد نہ ایسا کوئی اُستاد آیا

۱۹۳۱

قیامت ہے تمہارے حسُن کی یہ رُوح افزائی
کلیجہ تھامتی ہے دیکھ کر اس کو مسیحائی

یہ کس کے حسُن کی تصویر ہے دل میں اُتر آئی
کہ آنکھوں میں نہیں جچتی کسی شاہد کی رعنائی

کرو پھر غرق توبہ کو ئے گلگوں کے ساغر میں
مبارک تم کو اے رندو کہ پھر فصلِ بہار آئی

بہارِ حسن کے جلووں سے رونق دے گلستاں کو
کہ ہر اک پھول ہر اک خار ہے تیرا تمنّائی

کسی کو کوئی کیا دے گا کہ سب محتاجِ خالق ہیں
درِ انساں پہ لا حاصل ہے انساں کی جبیں سائی

۱۹۳۰

آنکھ سے آنکھ بے نیاز نہیں
دل سے پوشیدہ دل کا راز نہیں

ناز اگر ہے تو تیری رحمت پہ
اپنے عصیاں پہ مجھ کو ناز نہیں

یاس میں بجھ کے رہ گیا ہوں میں
اب تو نالہ بھی دل گداز نہیں

جامِ گیتی نما ہے دل میرا
اس سے پوشیدہ کوئی راز نہیں

دونوں عالم سے بے نیاز ہوں میں
تجھ سے لیکن میں بے نیاز نہیں

لے گئی میرے دل کو اس کی ادا
دل رُبا ہے وہ دل نواز نہیں

بھر گیا عشق سے بھی دل اے عرشؔ
اب وہ پہلا سا سوز و ساز نہیں

۱۹۳۰

خاموش رہ کے جان و جگر سب فدا کئے
سَو آفتیں اُٹھائیں مگر لب نہ وا کئے

تاثیرِ آہ کی یہ کرامت تو دیکھنا
رحمت کے باب مجھ پہ فرشتوں نے وا کئے

صحرائے عشق میں ہے وہی دل کا رہنما
اُلفت کے حوصلے اُسے جس نے عطا کئے

خود چشمِ شوق پردۂ حیرت میں چھپ رہی
پردے حریمِ ناز کے اکثر اُٹھا گئے

رکھی نہ اُس نے کافر و دیندار میں تمیز
سب اک سرے سے بستۂ دامِ بلا گئے

رہتا ہے اپنی ضد کا اُسے پاس اس قدر
وعدے اگر کئے تو نہ مطلق وفا کئے

کیا عشق سے ہیں حُسن کی بے التفاتیاں
ہنس ہنس کے عرش وہ مرے نالے سُنا کئے

۱۹۳۰

پاشکستہ کیوں مجھے اے شوقِ منزل کر دیا
کیوں مری راہِ طلب کو اور مُشکل کر دیا

مجھ پہ یہ اُلٹا اثر کیا تو نے اے دل کر دیا
سازِ محفل ہو کے مجھ کو سوزِ محفل کر دیا

مجھ کو گردابِ فنا میں ڈوبنے کا غم نہیں
میری نظروں سے مگر کیوں دُور ساحل کر دیا

شوق کی رنگینیوں میں اک نئی شان آ گئی
تُو نے جب خونِ تمنّا اُن میں شامل کر دیا

سیرِ گلشن کی ضرورت مُجھ کو اے ہمدم نہیں
اشکِ خوں نے گل بداماں دامنِ دل کر دیا

امتیازِ کعبہ و بُت خانہ اب بے کار ہے
بے خودی نے دُور فرقِ حق و باطل کر دیا

رونقِ بزمِ تمنّا سجدہ گاہِ آرزو
ایک دل تھا وہ بھی ناکامی نے بے دل کر دیا

کچھ نظر آئے مجھے ساقی اے غبارِ کارواں
تو نے آ کر بیچ میں کیا پردہ حائل کر دیا

لذّتِ احساسِ اُلفت سے بھی اب محروم ہُوں
دل کے کھو جانے نے مجھ کو عرشؔ بے دل کر دیا

۱۹۲۹

مرے درد کو لادوا کر دیا
محبت نے کیا جانے کیا کر دیا

یہ کیا ابتدا تھی مرے عشق کی
مرے غم کو لا انتہا کر دیا

دعا گو ہوں اس کی بقا کے لئے
مجھے جس کے غم نے فنا کر دیا

مرے عشق ہی کا یہ احسان ہے
تمہیں دیکھئے کیا سے کیا کر دیا

رہی آپ کی بدگمانی رہی
فغاں کو بھی ہم نے دُعا کر دیا

جتا کر انہیں پاسِ اُلفت کا فرض
جو تھا فرض ہم نے ادا کر دیا

فراق آفریں کس قدر ہے فراق
مرا دل بھی مجھ سے جدا کر دیا
تخلّص نے بخشی یہ رفعت مجھے
مرا شعر عرش آشنا کر دیا

۱۹۲۹

خود میں اک دامنِ صد چاک ہوں اے وحشتِ دل
کیا ہوا چاک جو کوئی مرے دامن میں نہیں
گیسوئے حور مبارک ہو تجھی کو اے شیخ
شکر کرتا ہوں یہ پھندا مری گردن میں نہیں
ہاں ادھر آ، تو کدھر جاتی ہے اے برقِ فنا
میں قفس میں ہوں کوئی میرے نشیمن میں نہیں
یوں تو موجود ہیں اُمید کی کلیاں لاکھوں
گلِ مقصود مگر ایک بھی دامن میں نہیں
ناتوانی میں ہے بے کار مری ہر کوشش
نذرِ تاثیر بھی اب نالہ و شیون میں نہیں

۱۹۲۹

داغہائے دل پہ ہے موقوف شانِ آرزو
ہے انھیں تاروں سے روشن آسمانِ آرزو

ہم تجھے اے رونقِ گلزارِ عالم کیا کریں
پھولتے دیکھا نہ ہم نے گلستانِ آرزو

اک طرف ہے وحشتِ حسرت اک طرف صحرائے یاس
ہے خدا ہی رہنمائے کاروانِ آرزو

مجھ میں بھی ضبطِ محبّت کی سکت باقی نہیں
جو تجھے کہنا ہے کہ دے اے زبانِ آرزو

کس طرح خلوت میسّر ہو مجھے خلوت میں عرش
گوشۂ دل میں نہاں ہے اک جہانِ آرزو

۱۹۲۹

حسینوں کے ستم کو مہربانی کون کہتا ہے
عداوت کو محبّت کی نشانی کون کہتا ہے

یہ ہے اک واقعی تفصیل میری آپ بیتی کی
بیانِ دردِ دل کو اک کہانی کون کہتا ہے

یہاں ہر دم نئے جلوے یہاں ہر دم نئے منظر
یہ دُنیا ہے نئی اس کو پُرانی کون کہتا ہے

تجھے جس کا نشہ ہر دم لئے پھرتا ہے جنّت میں
بتا اے شیخ اس کوثر کو پانی کون کہتا ہے

طریقہ یہ بھی ہے اک امتحانِ جذبۂ دل کا
تمھاری بے رُخی کو بدگمانی کون کہتا ہے

بلا ہے قہر ہے آفت ہے فتنہ ہے قیامت کا
حسینوں کی جوانی کو جوانی کون کہتا ہے

فنا ہو کر بھی حاصل ہے وہی رنگِ بقا اس کا
ہماری ہستیٔ فانی کو فانی کون کہتا ہے

ہزار دل رنج اس میں عرش لاکھوں کلفتیں اس میں
محبّت کو سرورِ زندگانی کون کہتا ہے

۱۹۲۹

مرا دل ہی مرے دل کا بیاں ہے
محبّت کی دو حرفی داستاں ہے
کوئی دیکھے قفس والوں کی حالت
اُٹھا گلشن کی جانب سے دُھواں ہے
سُنا کرتے تھے دل کی بے دلی کو
زباں بھی تیرے آگے بے زباں ہے
تجھے ہر اک جگہ دیکھا ہے پھر بھی
ابھی سمجھا نہیں میں تو کہاں ہے
ذرا ہمّت سے او گُم کردہ منزل
ابھی کچھ دُور گردِ کارواں ہے
فغاں کو عرش تک پہنچا ہی دیں گے
ہُوا کیا دل جو اپنا ناتواں ہے

۱۹۲۸

لُطف اِتنا تو مجھے عشق میں حاصِل ہوتا

حُسن کی بزم میں آئینہ مرا دل ہوتا

اے جنوں میں ترے اعجاز کا قائل ہوتا

دل جو منزل پہ بھی آوارۂ منزل ہوتا

ہر نفس نالہ و فریاد کا حامل ہوتا

حال فرقت میں جو اظہار کے قابل ہوتا

اے مرے عِشق کو کامل نہ سمجھنے والے

میں نہ ہوتا تو ترا حُسن نہ کامل ہوتا

کاش وہ ایک تصنّع نہ سمجھتے غم کو

وہ مجھے دیکھتے اور ان سے میں غافل ہوتا

شمع پر شوق سے پروانے مٹے جاتے تھے

رشک تھا مجھ کو کہ میں بھی کسی قابل ہوتا

آرزو دل کی کبھی ڈوب نہ جاتی دل میں

میری نظروں میں جو اس بحر کا ساحل ہوتا

اس کی فطرت تو ہے طوفان سے لڑتے رہنا
دل مرا کس لیے آسودۂ ساحل ہوتا

تیر و نشتر ترے اشعار بھی ہوتے اے عرش
تیرے پہلو میں اگر درد بھرا دل ہوتا

۱۹۲۸

سبیلِ بادۂ کوثر ہے جوئبارِ چمن
بہارِ خلد سے بھی ہے سوا بہارِ چمن

شعاعِ مہر سے پُر نور ہے عذارِ چمن
بنا ہے تختۂ گل تختِ زرنگارِ چمن

یہ ارتباطِ بہارِ گل و بہارِ چمن
چمن نثار ہے گل پر تو گل نثارِ چمن

ہوئے ہیں پردہ درِ رازِ زندگی کیا کیا
بہارِ فانیٔ گل حسنِ مستعارِ چمن

بھڑک اُٹھے نہ گلستاں میں آگ اے گلچیں
سنبھل کے توڑ کہ ہر پھول ہے شرارِ چمن

جنوں ہے مجھ کو تو ہر گل کا بھی ہے دامن چاک
مری بہار پہ قربان ہے بہارِ چمن

یہاں بھی عرشؔ وہی لطفِ بادہ نوشی ہے
ہے دشت میں بھی میسّر ہمیں بہارِ چمن

۱۹۲۸

جو دل میں ہے وہ کیوں نہ آئے زباں تک
محبّت کے صدمے سہوں میں کہاں تک

جو ارمان دل میں ہیں اے ضبطِ اُلفت
فغاں بن کے آنے کو ہیں اب زباں تک

یہاں اے غمِ دل میں جس حال میں ہوں
اُسی حال میں مجھ کو لے چل وہاں تک

پھر آیا تری جستجو نے ہمیشہ
نہ پہنچا مگر میں ترے آستاں تک
نکل کر رہے ہیں عرش آنکھوں سے آنسو
کرے کوئی ضبطِ محبّت کہاں تک

۱۹۲۸

حاجتِ جام نہیں جام میں کیا رکھا ہے
دل تو اُس آنکھ کا دیوانہ بنا رکھا ہے
کیا تماشا یہ محبّت نے بنا رکھا ہے
دل کو فریاد کے پہلو میں بٹھا رکھا ہے
کیا نئے ڈھب کے ستم آپ نے ایجاد کئے
ہاتھ اُٹھانے سے بھی اب ہاتھ اُٹھا رکھا ہے
تابشِ نُور سے خیرہ ہیں نگاہیں سب کی
آپ کے حُسن نے اندھیر مچا رکھا ہے

اب وُہ مرقد پہ سرِ شام ہی آجاتے ہیں
ہم نے سو کر بھی نصیبے کو جگا رکھا ہے

سننے دیتا ہی نہیں دل اُنھیں فریاد مری
اس نے اپنا ہی الگ شور مچا رکھا ہے

داد دے کہ ابھی پلٹی نہیں آہیں دل کی
عرش پر ہم نے نگاہوں کو لگا رکھا ہے

۱۹۲۸

وہ گم گشتہ مسافر ہوں کہ اپنی آپ منزل ہوں
مجھے ہستی سے کیا حاصل میں خود ہستی کا حاصل ہوں

سُنا ہے تیری رحمت جرمِ عصیاں سے فزوں تر ہے
اسی اُمید پر یا رب گنہگاروں میں شامل ہوں

مرے ضبطِ محبّت نے بھی رسوا کر دیا مجھ کو
سکوں خود مجھ سے کہتا ہے کہ میں بے تابیٔ دل ہوں

مری مایوسیوں سے رنگِ استغنا جھلکتا ہے
نہ ارمانوں پہ مایل ہوں نہ امیدوں کا قایل ہوں

لٹا کر دولتِ ایماں کو پہنچا اصلِ ایماں تک
زمانہ ہوشیاری جس سے سیکھے میں وہ غافل ہوں

مرے سازِ شکستہ سے یہی آواز آتی ہے
میں اک پھوٹی ہوئی قسمت ہوں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

مری نیرنگیوں کو عرش تم سمجھو تو کیا سمجھو
کبھی دیوانۂ دل ہوں کبھی بیگانۂ دل ہوں

۱۹۲۷

بے تاب نہیں عشق کی دنیا مرے آگے
رقصاں ہے ترے حُسن کا جلوا مرے آگے

اے جوشِ طلب تُو ہو تو پروا نہیں مجھ کو
صحرا مرے آگے ہو کہ دریا مرے آگے

مرکر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے

وہ مست ہوں لاتا ہے مرا دستِ تصوّر
ساغر مرے آگے کبھی مینا مرے آگے

خود حُسن کا خاکہ ہے یہ خود عشق کا نقشہ
ہے خواب بھی تعبیر بھی دنیا مرے آگے

ہنگامۂ عالم کی حقیقت ہے یہی جوشؔ
ہوتا ہے مرے عشق کا چرچا مرے آگے

۱۹۲۶

پہلا دور

نظمیں

ماتمِ بہار

کچھ ولولے اُٹھے تھے مگر اُٹھ کے مر گئے
دُنیائے سوز و ساز کو برباد کر گئے
جذبات پر جمود کا الزام دھر گئے
افسردگی کا رنگ زمانے میں بھر گئے
اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

حاصل ہُوا نہ کچھ مجھے ذوقِ نیاز سے
دیکھا کسی نے بھی نہ مجھے چشمِ ناز سے
نکلا نہ کوئی نغمہ محبّت کے ساز سے
سر اُٹھ سکا نہ میرا جنوں کی نماز سے
اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

اب بھی دلِ حزیں ہے رہینِ صد اضطراب
اب بھی ہے آرزوؤں کا ماتم کدہ شباب
اُن کو ہُوا نہ اب بھی کدورت سے اجتناب
آیا نہ اب بھی اُن کی محبّت میں انقلاب

اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

یُوں تو ہر ایک شاخ تھی تصویرِ دل نشیں
ہر برگ یوں تو صحنِ گلستاں کا تھا حسیں
پھُولوں سے یُوں تو غیرتِ ارژنگ تھی زمیں
گُلہائے آرزو نہ ملے باغ میں کہیں

اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

اب میں ہوں اور طفلِ تسلّی قرار کی
دل ہی میں رہ گئی ہیں جو باتیں تھیں پیار کی
ٹوٹے نہ آس کیوں دلِ اُمیدوار کی
نکلی نہ پھانس وہ خلشِ انتظار کی

اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

قیدِ قفس میں رہ کے ہیں صحنِ چمن سے دور
دل بجھ گیا تو اس میں ہمارا ہے کیا قصور
فریاد کر سکیں نہیں اتنا بھی اب شعور
صیّاد کو مگر یہ سنا دیں گے ہم ضرور
اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

افسوس اب بھی دامنِ حسرت نہ سِل سکا
افسوس اب بھی لطفِ مسرّت نہ مل سکا
افسوس عرش آہ سے اب بھی نہ ہل سکا
افسوس اب بھی غنچۂ مقصد نہ کھل سکا
اب کے بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

۱۹۳۵

دیہاتی زندگی

گوشۂ مغرب میں جا کر ڈھل چکا ہے آفتاب
دن کی سب سرگرمیاں ہونے کو ہیں مصروفِ خواب

ہر فضا پر پرچمِ شب رنگ لہرانے کو ہے
روشنی اب جا رہی ہے تیرگی آنے کو ہے
نغمہ زن ہونے کو ہے دوشیزۂ شب کا رباب
ڈالنے ہی کو ہے دن چہرے پہ ظلمت کی نقاب
تابشیں سب سرد ہیں کرنوں کا پہرا ہو چکا
دُور افق کے پاس ہر منظر سنہرا ہو چکا
گھر کی جانب رُخ کیئے ماتھے پہ بل ڈالے ہُوئے
اک کسان ایسے میں ہے کاندھے پہ ہل ڈالے ہوئے
لیکن اس ماتھے کے بل میں بھی ہے ایسا اہتمام
دے نہیں سکتے جسے ہم غصّہ و حیرت کا نام
کچھ تھکن کا ہے اثر کچھ دن کی محنت کا خیال
کچھ تفکّر، کچھ تصوّر، کچھ مشقّت کا خیال
گھر کی جانب والہانہ شان سے جاتا ہے وُہ
گا رہا ہے اپنی دُھن میں گیت اک گاتا ہے وُہ
آسماں پر وجد کا عالم ہے بے خود ہے زمیں
کھیتیوں سے آ رہی ہے یہ صدائے دِل نشیں

ہے یہ بنیادِ نظامِ کائناتِ زندگی
ہے اسی کے دم سے وابستہ ثباتِ زندگی

۲

اِک طرف یہ حال ہے اور دوسری جانب یہ حال
گھر میں بیٹھا ہے کسان اندوہگین و پُر ملال
روشنی سے اور ہوا سے سر بسر محفوظ گھر
جس میں انساں اور حیواں کے لئے بس ایک در
اِک طرف بیلوں کا چارہ اِک طرف اُپلوں کا ڈھیر
جھڑ رہے ہیں ایک جانب صحن کی بیری کے بیر
اک طرف گوبر کی خوشبو مشک عنبر بیز ہے
چرچراہٹ کھاٹ کی لحنِ سرور انگیز ہے
ناچتے ہیں اِک طرف بچے بجا کر تالیاں
مل رہی ہیں اک طرف جورو کو باہم گالیاں
کچھ نہ پوچھو فکر میں ہے آج کیوں اتنا غریب
سود ادا کرنے کا شاید آگیا ہے دن قریب

جو بُری رسموں میں پھنس کر قرضخواہوں میں گھرا
اس عذابِ دائمی سے مخلصی اس کی ہو گیا

جو پکائے اپنا کھانا کھاد کے ڈھیروں کے پاس
کس طرح مانیں کہ قائم ہیں ابھی اُس کے حواس

پھر کہاں صحت جو گھر میں روشنی کافی نہیں
اک مشقّت کی دوا ہی نسخۂ شافی نہیں

سادگی کے ساتھ کچھ رنگِ جہالت کی نمود
کچھ قناعت کا فریب اور کچھ ہے غیرت کا جمود

کچھ تو کم تعلیم کچھ طرزِ سکونت ہے خراب
کچھ بُری رسموں کا پھندا کچھ ہے قرضے کا عذاب

اس طرح بیگانۂ نشو و نما رہتا ہے یہ
اپنے ہاتھوں تختۂ مشقِ جفا رہتا ہے یہ

گردشِ تقدیر کو رو رو کے کرتا ہے سلام
الغرض یہ زندگی اس کی ہے عبرت کا مقام

۱۹۳۵

سازِ خاموشی

فلک پر انجمِ تاباں تھے مصروفِ درخشانی
برستا تھا زمیں پر آسماں سے نُور کا پانی
شعاعیں اپنا سیمیں جال دنیا پر بچھاتی تھیں
در و دیوار پر پڑ کر طلسمِ شب مٹاتی تھیں
کچھ ایسے اوڑھ رکھی تھی فضا نے نور کی چادر
گماں ہوتا تھا جس پر یہ کہ ہے بلّور کی چادر
لیئے ہاتھوں میں نیزے چاند کی کرنیں جھپٹتی تھیں
سیہ پوشانِ تاریکی کی ہر صف کو اُلٹتی تھیں
سیاہی کا کہیں اشجار کے سائے میں ڈیرا تھا
کہیں تاریک غاروں میں ملا اس کو بسیرا تھا
جو منظر تھا وہ سیمیں تھا جو نظّارہ تھا سیمابی
منانے کو تھی فطرت آج گویا جشنِ مہتابی

بڑھے آتے تھے لشکر نور کے، کرنوں کی فوجیں تھیں
سمندر زور پہ تھا اور طوفاں خیز موجیں تھیں
زمیں پر آسماں پر کوہ پہ وادی پہ دریا پر
چمن پر شہر پہ بستی پہ ویرانے پہ صحرا پر
مساجد اور منادر ہوٹلوں اور قہوہ خانوں پر
غریبوں کے گھروں پر اور امیروں کے مکانوں پر
سمندر کے کناروں اور پہاڑوں کی چٹانوں پہ
جہازوں کے نشانوں کشتیوں کے بادبانوں پہ
غرض ہر جسم پہ ہر چیز پہ تھا نُور کا عالم
جہاں کے ذرّے ذرّے پر تھا برقِ طور کا عالم
نظر کے سامنے تھا اس طرح نظّارۂ فطرت
کہ فطرت جھولتی ہے آج خود گہوارۂ فطرت
فلک نقّاشیوں کے رنگ جب فطرت میں بھرتا تھا
میں ان نقاشیوں میں جستجوئے شعر کرتا تھا
مناظر دیکھ کر میں ہو رہا تھا محوِ مدہوشی
مرے کانوں میں آتی تھی صدائے سازِ خاموشی

۱۹۳۵

رقّاصہ

اے رقّاصہ ناچ ذرا   ہم سب کو دیوانہ کر
محفل میں وہ شمع جلا   محفل کو پروانہ کر
مست بنا سرمست بنا   اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھنک چھنا چھن چھن چھن چھن

جھوم ذرا سرمستی سے   جھوم کے اک انگڑائی لے
غافل ہو کر ہستی سے   ہاتھ میں اک شہنائی لے
شہنائی کو لب تک لا   اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھنک چھنا چھن چھن چھن چھن

البیلے انداز سے پھر　　جلوے آج مچلنے دے
لعلیں لب کے ساز سے پھر　　نغمے آج نکلنے دے
نغموں کا اک مینہ برسا　　اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھنک چھنا چھن چھن چھن

زیر و زبر کر عالم کو　　ہوا فلاک سے گرم سخن
بیچیم کر دے مدّھم کو　　تیرے پیروں کی جھانجھن
تیزی سے پھر گھوم کے آ　　اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھنک چھنا چھن چھن چھن

شوق ہمارے تیز ہیں پھر　　دیکھ کے ڈورے آنکھوں کے
اک مے سے لبریز ہیں پھر　　لال کٹورے آنکھوں کے
اس مے کا اک جام پلا　　اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھنک چھنا چھن چھن چھن چھن

متوالی رفتار سے پھر کر بیدار اُمنگوں کو
جھانجھن کی جھنکار سے پھر کر بے تاب ترنگوں کو
دل میں کر اک حشر بپا اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھَنک چھنا چھن چھن چھن چھن

جھانجھن کو خاموش نہ کر دیوانوں کو جینے دے
مست بنا بے ہوش نہ کر نغموں کی مے پینے دے
وہ آئی گھنگھور گھٹا اے رقّاصہ ناچ ذرا

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
چھَنک چھنا چھن چھن چھن چھن

۱۹۳۵

دیوالی

رگھبر کی پاک یاد کا عنواں لئے ہوئے
ظلمت کے گھر میں جلوۂ تاباں لئے ہوئے
تاریکیوں میں نور کا ساماں لئے ہوئے
آئی ہے اپنے ساتھ چراغاں لئے ہوئے

اللہ رے یہ تاب، یہ تنویر، یہ جمال
خورشید کی نظر بھی ہے جمنی یہاں محال

طاری ہے زاہدوں پہ بھی عالم سرور کا
اب کس لئے خیال ہو حور و قصور کا
عالم تو دیکھئے شبِ یلدا پہ نور کا
جلتے ہیں یہ چراغ کہ جلوہ ہے طور کا

منظر بہشت کا ہے یہ شب ہے شب برات
تنویر آفتاب کا ہے پرتوہ یہ رات

وُہ رام جو کہ مائلِ صدق و صفا رہا
وُہ رام جو کہ سالکِ راہِ ہُدا رہا
وُہ رام جو کہ آئینۂ حق نما رہا
وُہ رام جو کہ قاطعِ جور و جفا رہا

یہ رات یادگار ہے اس نیک ذات کی
اِس پیکرِ خلوص کی، والا صفات کی

چودہ برس کے بعد جو آئے وطن میں رام
ہر لب تھا وقفِ نغمہ تو ہر دل تھا شاد کام
تھی رشکِ نورِ صبحِ بنارس اودھ کی شام
اہلِ اجودھیا کی زباں پر تھا یہ کلام

ہم بے کسوں کا قافلہ سالار آگیا
بن باسیوں کی فوج کا سردار آگیا

۱۹۳۵

چاند سے شکایت

(بے عطف و اضافت)

کس کو اپنا رنج بتاؤں کس کو حال سناؤں میں
کون انھیں دیکھے گا کس کو دل کے داغ دکھاؤں میں
غم کی آگ جلاتی ہوں میں دل کے آتش خانوں میں
اپنا حال سناتی ہوں میں سوز بھرے افسانوں میں
اب وہ دل میں شوق نہیں ہے اب وہ دل میں جوش نہیں
ایسا حال ہوا ہے میرا مجھ کو اپنا ہوش نہیں
آنکھ میں آنسو لب پر نالہ، دل میں داغ محبّت کا
سوز بہت ہے رنج بہت ہے درد بہت ہے فرقت کا
پہلو میں اک دل ہے لیکن ہے مجبور مچلنے سے
دل میں ایک فغاں ہے لیکن ہے معذور نکلنے سے
ایک گلہ ہے، اک شکوہ ہے ایک شکایت کرتی ہوں
دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر درد سے آہیں بھرتی ہوں

میں تو اک ناکام بھی ہوں مجبور بھی ہوں لاچار بھی ہوں
تنگ بھی ہوں اس دُنیا سے اس جینے سے بیزار بھی ہوں
تجھ کو، مگر اے چاند بتا دے، مجھ پہ ہنسی کیوں آتی ہے

دل کی سب اُمیدوں پر تاریکی یاس کی چھائی ہے
رُوح شگفتہ کیوں کر ہو جب دل کی کلی مُرجھائی ہے
کیا معلوم ہے پاپی من کب رنج کی قید سے چُھوٹے گا
آئے گی کب موت مجھے کب تارِ نفس کا ٹوٹے گا
دل میں اک فریاد ہے لیکن اس میں بھی خاموشی ہے
اُلفت کی پُر شوق اُمنگوں میں بھی اک مدہوشی ہے
سینے میں اک سوزِ نہاں ہے سوز بھی ہے وُہ اُلفت کا
تیر لگا ہے ایک جگر میں تیر بھی ہے وُہ فرقت کا
آہ میں ہے اک بجلی ایسی ضبط کا خرمن خاک ہُوا
درد میں ہے اک وحشت ایسی صبر کا دامن چاک ہُوا
اور کسی کو دُنیا میں مجھ دُکھیاری کا پاس نہیں
اور کسی کو دُنیا میں اِن باتوں کا احساس نہیں

روتی ہوں رو رو کے اپنے دل کی آگ بجھاتی ہوں
میں تو اپنی بے چینی سے اپنا جی بہلاتی ہوں
تجھ کو اگر اسے چاند بتا دے مجھ پہ ہنسی کیوں آتی ہے

۱۹۳۲

شاہجہان کے آخری جذبات

(روضۂ تاج محل کو دیکھ کر)

تاج! اے مری شہنشاہی کے رنگیں شاہکار
اے مری ممتاز کی آرام گاہِ پُر وقار
اے مرے گزرے ہوئے اقبال و دولت کے نشاں
اے مرے دورِ جہانبانی کی زرّیں یادگار
اے مری عظمت کے ضامن اے مری آنکھوں کے نور
اے مرے اُجڑے ہوئے دل کے گلستاں کی بہار

اے مرے عہدِ وفا کی استواری کے نشاں
اے مرے پاسِ محبّت کی قسم کے پاسدار
اے مرے شوکت مری حشمت کی دلکش داستاں
اے مری تقدیر کی رنگینیوں کے جلوہ زار
مظہرِ شانِ کمال اے پیکرِ نور و جمال
حُسن و خوبی کے امیں اے بے عدیلِ روزگار
اے الم افزائے دل تازہ کُن داغِ فراق
مدفنِ آرام جاں میری امیدوں کے مزار
دیکھ کر تجھ کو مجھے راحت بھی ہے اور غم بھی ہے
فخرِ ماضی بھی ہے کچھ اور حال کا ماتم بھی ہے
آہ وُہ سطوت وہ ہیبت آہ وہ میرا جلال
آہ وُہ شانِ حکومت آہ وہ اوجِ کمال
اُف وہ جوشِ آرزو وہ عیش و عشرت کے دن
اُف یہ مرجھایا ہُوا دل اُف یہ افسردہ سا حال
اُف وہ شانِ خسروی وہ رُتبہ وہ جاہ و حشم
اُف یہ وحشت یہ گراں جانی یہ پستی یہ زوال

اُف وہ ممتاز اور میں وہ مہ وشوں کے جمگھٹے
اُف یہ ضبطِ شوق یہ آشفتگی کی قیل و قال
اُف کہ تجھ کو دیکھ کر ہوتے ہیں تازہ زخمِ دل
اُف کہ تیرا نام ہو مجموعۂ حزن و ملال
مجھ کو دیکھ اور دیکھ زورِ انقلابِ آسماں
کس طرح ہستی مری اب ہو رہی ہے پائمال
تو ہوا مقبولِ عالم جس کے دستِ فیض سے
دیکھ نا ممکن ہے اُس کے زخمِ دل کا اندمال
پہلوئے محبوب میں للّٰہ بُلا لے اب مجھے
کچھ بھی ہو آغوش میں اپنی سُلا لے اب مجھے

۱۹۳۲

گیت

جاگا سب سنسار اُٹھو اب بھور بھئی

شبنم نے موتی رولے
کلیوں نے گھونگھٹ کھولے
سب سوئے پنچھی بولے   ہوئی گیت گنجار   اُٹھو اب بھور بھئی
جاگا سب سنسار ------

جاگا ہر پریتم پیارا
درشن مد کا متوارا
ہر من میں ہوا اُجیارا   کھلے پریم کے دوار   اُٹھو اب بھور بھئی
جاگا سب سنسار -----

مندر کو چلے نرناری
متوالے پریم پجاری
پوجن کے آشا دھاری   لو پوجن اُپہار   اُٹھو اب بھور بھئی
جاگا سب سنسار -----

ن تحفہ

پُوجن ہے ایک بہانہ
درشن ہے ایک فسانہ
کہتا ہے تمھیں زمانہ — کرو پریم سنچار — اُٹھو اب بھور بھئی
جاگا سب سنسار — — — — — — —

چلی پُجارن پُوجن کو

من دیپک کی جوت جگائے
من سے ہر سُدھ بُدھ بسرائے
من ٹھاکر سے آس لگائے — من ٹھاکر کے درشن کو
چلی پُجارن . . . . . .

کنگن بُوندے جھُومر تج کے[1]
پریم کے بھُوشن سے سج دھج کے
من ٹھاکر کو من میں بھج کے — اُجّل کرنے جیون کو
چلی پُجارن . . . .

[1] زیور

دھوپ دیپ اور پھول اُٹھا کر
ماتھے پر سیندور لگا کر
آنکھوں سے امرت چھلکا کر
پریتم کے آرادھن کو
چلی پجارن ......

کام کرودھ کو دور ہٹائے
آشا سے دامن کو بچائے
چنچلتا کو شانت بنائے
بسرانے من کلپن کو
چلی پجارن ......

اس سنسار کے دھیان کو ہرنے
اس سنسار سے پار اُترنے
پریتم روپ کو بس میں کرنے
صاف کئے من درپن کو
چلی پجارن ......

پائل کی جھنکار

ٹھِرک ٹھِرک لچکائی کمریا
مٹک مٹک مٹکائی نجریا

کانوں کے پٹ کھول کے پہنچی
گیتوں کی گنجار آہا! پائل کی جھنکار

تن بھی ناچے من بھی ناچے
بھیتر بھی آنگن بھی ناچے

ناچ ہی ناچ بسا گھر بھر میں
ناچے در دیوار۔ آہا! پائل کی جھنکار

سُورج چاند ستارے جُھومے
حُسن کے سب گہوارے جُھومے

چھنک چھنا چھن چھن چھن سن کر
جھُوما سب سنسار آہا! پائل کی جھنکار

چھانجھن چھن چھن کرتی جائے
بس میں ہر من کرتی جائے

اور اگر پل بھر نہیں باجے
من پہ چلے تلوار۔ آہا! پائل کی جھنکار

ساجن من کا چور

من میں ساجن رُوپ براجے
من کا مندر ساجن ساجے
من ساجن کی ٹھور سجنی ساجن من کا چور
کوئل کُوکی برکھا آئی
پریم سندیسا پروا لائی
ناچے من کا مور سجنی ساجن من کا چور
دُکھ کی کڑیاں توڑ رہی ہے
من کو من سے جوڑ رہی ہے
پریم کی لانبی ڈور سجنی ساجن من کا چور
لاکھ کٹیں رو رو کر راتیں
جھوٹی ہیں دُنیا کی باتیں
جھوٹا یہ سب شور سجنی ساجن من کا چور

سیج سنگار نہ بھائے

موسنگ کلپے موسنگ جاگے
نیر بھرے مرے نین ابھاگے
موتی رول گنوائے   پیا نہیں آئے
سیج سنگار نہ بھائے   - - - - -

آہ بھرت ہوں ہر کروٹ پر
چونک پڑت ہوں ہر آہٹ پر
رُوپ انیک دکھائے   پیا نہیں آئے
سیج سنگار نہ بھائے   - - - - -

موہ سے کیسے ہو چھٹکارا
چڑھتی آئے پریم کی دھارا
نیّا ڈوبت جائے   پیا نہیں آئے
سیج سنگار نہ بھائے   - - - - -

من کب سے درشن کا پیاسا
آس کہاں چھائی ہے نراسا
من کیسے کل پائے   پیا نہیں آئے
سیج سنگار نہ بھائے   - - - - -

پریتم کب گھر آؤ گے

بیت رہے ہیں دن کلپن میں
آگ لگی ہے تن میں من میں
بیٹھی ہوں بس ایک لگن میں — کب تک یوں تڑپاؤ گے — پریتم کب گھر آؤ گے

مجھ دکھیا کو غم نے گھیرا
چھایا چار طرف اندھیرا
ہوگا اب اُس وقت سویرا — جب مکھڑا دکھلاؤ گے — پریتم کب گھر آؤ گے

شام ہوئی اور بادل چھائے
من تڑپے اور جی لہرائے
پریم کی نیّا ڈوبی جائے — کِس دم پار لگاؤ گے — پریتم کب گھر آؤ گے

پریم کی لَے میں تان اُڑا کر
نین سے پریم کا مَد چھلکا کر
پریم سے پریم کا گیت سُنا کر — کب مجھ پر چھا جاؤ گے — پریتم کب گھر آؤ گے

آئی گھٹا گھنگھور

بجری کوندے بادر آئیں
چھم چھم چھم مینہ برسائیں
کویل اور پپیہا گائیں

شور مچائیں مور ۔ سکھی ری
آئی گھٹا گھنگھور

نیہہ کی لہروں میں لہرا کر
پریت کی شیتل پون چلا کر
من کا ایک پتنگ بنا کر

پریم کی ڈالیں ڈور ۔ سکھی ری
آئی گھٹا گھنگھور

من میں اس کی جوت جگالیں

من میں اس کا رُوپ بسالیں

من میں اس کا پریم جمالیں

من پریتم کی ٹھور - سکھی ری

آئی گھٹا گھنگھور

تاروں کے منڈل میں ڈھونڈو

نگری میں جنگل میں ڈھونڈو

تھل میں ڈھونڈوں جل میں ڈھونڈو

کہاں گئے چت چور - سکھی ری

آئی گھٹا گھنگھور

ساون آگیا

سکھی پیا نہیں آئے ساون آگیا

ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے
کلی کلی کو چوم رہی ہے

برہی من للچائے ۔ ساون آگیا
سکھی پیا نہیں آئے ۔ ساون آگیا

کنج کنج چھائی ہریالی
آئیں گھٹائیں کالی کالی

بدرا شور مچائے ۔ ساون آگیا
سکھی پیا نہیں آئے ۔ ساون آگیا

رم جھم رم جھم پانی برسے
نین پیا درسن کو ترسے

برہی من لہرائے ساون آگیا
سکھی پیا نہیں آئے ۔ ساون آگیا

پی پی پی کرے پپیہا
دکھ کی آہیں بھرے پپیہا

کوئل کوک سنائے ۔ ساون آگیا
سکھی پیا نہیں آئے ۔ ساون آگیا

آشاؤں سے من کو سنبھالے
کب سے کھڑی ہوں جھولا ڈالے

جھولا کون جھلائے ۔ ساون آگیا
سکھی پیا نہیں آئے ۔ ساون آگیا

رتوراج بسنت

آئے ہیں رِتو راج

چڑھ آئیں پھولوں کی فوجیں
لہرائیں خوشبو کی موجیں

بَن اُپ بَن میں آج
آئے ہیں رِتو راج

پھولوں کے ہیں سُندر گہنے
ہری ہری سرسوں نے پہنے

پیلے پیلے تاج
آئے ہیں رِتو راج

پی چھب سے نیناں مل جائیں
پھول کھلیں من بھی کھل جائیں

رہے ہماری لاج
آئے ہیں رتو راج

کیوں چُپ ہیں گگن کے تارے

سنسار ہے پاپ کی نگری کیا
دُکھ دھام ہے دنیا سگری کیا
کیا رُشٹ ہیں پرانی سارے
کیوں چُپ ہیں گگن کے تارے

آکاش کے راج دُلارے ہیں
اتی سندر پیارے پیارے ہیں
پھر بھی ہیں پڑے من مارے
کیوں چُپ ہیں گگن کے تارے

کیوں آنکھ بچا کر بادل سے
نیلے آکاش کے آنچل سے
اب کرتے نہیں اشارے
کیوں چپ ہیں گگن کے تارے

ہنستے بھی نہیں روتے بھی نہیں
بیاکل اتنے، سوتے بھی نہیں
تکتے ہیں نین اُگھارے
کیوں چپ ہیں گگن کے تارے

پرانی یانورا

پرانی با نورا جیون پر اترائے
تیز ہوا کے رُخ پر بیٹھا آشا دیپ جلائے

پرانی با نورا جیون پر اترائے

پل بھر کی مُسکان کنول کی بھونرا لپٹا جائے
ایک بوند رس کی ترشنا پر اپنا آپ گنوائے

پرانی با نورا - - - - -

سپنے میں اک موہنی مورت دیکھ جیا للچائے
آنکھ کھلے تو کچھ نہیں دیکھے مُورکھ دھوکا کھائے

پرانی با نورا - - - - -

من کلپن دکھ ریت کے اُوپر سُکھ ساگر دکھلائے
سکھ کی اک اک ہر انت میں مرگ ترشنا بن جائے

پرانی با نورا - - - - -

دِوالی

گھر گھر دیپ جلے، دِوالی آئی

رجنی[1] روپ دوس[2] سم سوہے
پورنیما[3] کو اماوس موہے
دن کو رین چھلے دِوالی آئی
گھر گھر دیپ جلے دِوالی آئی

ستیہ وجے[4] مہما درشائے[5]
سیتا رام لکھن گھر آئے
سب دُکھ دَرد ٹلے، دِوالی آئی
گھر گھر دیپ جلے دِوالی آئی

دیپ جلے ہیں اندر باہر
مندر ماہیں تال کے تٹ پر
ہر اک پیڑ تلے، دِوالی آئی
گھر گھر دیپ جلے دِوالی آئی

کامنیا سم کھائے جھکولے
جگ مگ جگ مگ اُڑیں ہنڈولے
نبھ[6] پہ ریل چلے، دِوالی آئی
گھر گھر دیپ جلے، دِوالی آئی

[1] رات [2] دِن [3] پوران ماسی [4] فتح [5] دکھاکر [6] آسمان

بانسری

یہ کس نے بجائی بانسری

کچھ پا کے اشارے جمنا کے
کس نے یہ کنارے جمنا کے

اک تان اڑائی مدھ بھری
یہ کس نے بجائی بانسری

کاہن تو نہیں متوالا یہ
ہم گوپیوں کا رکھوالا یہ

کس کی ہے یہ صورت ساوری
یہ کس نے بجائی بانسری

رسیا ساون کی راتوں کا
بھیگی بھیگی برساتوں کا

چیت چپہ رنجن نرہری
یہ کس نے بجائی بانسری

۲۴۳

